قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست ۱۹۵۸ء

شائع کردہ :-
ادارۂ طلوع اسلام
B—25 گلبرگ کالونی، لاہور
قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر 7500
ہندوستان اور پاکستان کے سالانہ آٹھ روپے	ہندوستان اور پاکستان کے	خط و کتابت کا پتہ:-
غیر ممالک کے ۱۴ شلنگ	بارہ آنے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام 25/8 گل برگ کالونی۔ لاہور

جلد ۱۱ | اگست ۱۹۵۸ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

لمعات		۲
اسلامی مملکت کا تصور	ڈاکٹر یحییٰ الخشب پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی	۱۲
سلیم کے نام	(محترم پرویز صاحب)	۱۷
مجلس اقبال		۲۵
مغربی سرمایہ دارانہ نظام پر اسلامی خطبہ	(چوہدری محمد اسمٰعیل صاحب راولپنڈی)	۳۳
حلال و حرام		۵۱
جرم قتل کی سزا		۶۲
انتخابی منشورات		۶۹
رابطۂ باہمی		۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زیستن تلک بہ بحر اندر چو خس

اسلام، دنیا کے مذاہب میں، نوعِ انسانی کے لئے ایک دین لے کر آیا تھا۔ مذہب میں ہر فرد، کسی بالاتر ہستی کا تصور اپنے ذہن میں مرتسم کرتا اور اس کی بھگتی اور پرستش سے اس کے ساتھ ایک پرائیویٹ تعلق قائم کرتا ہے تاکہ اس سے اس کی نجات ہو جائے۔ مذہب کا دائرہ یہیں تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک نظامِ حیات کا نام ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہوتا ہے۔ اس نظام کی عمارت ان مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جو انسانوں کو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ دین کا زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہونے سے مطلب یہ ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ہر شعبہ (معاشرت۔ معیشت۔ سیاست وغیرہ) سب اس کے متعین کردہ اصولوں کے تابع رہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت ایک مذہب ہے۔ اگر کسی عیسائی ملک میں نظامِ حکومت ملوکیت ہے اور دوسرے میں جمہوریت۔ تو دونوں ملکوں کے باشندے سچے اور پکے عیسائی ہیں اگر وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ وغیرہ پر عقیدہ رکھتے اور کلیسا کے قواعد کے مطابق خدا کی پرستش کرتے ہوں۔ لیکن اسلام میں یہ صورت نہیں ہوگی۔ اگر کسی ملک کے باشندے خدا۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز روزے کے بڑی پابند ہوں، لیکن اگر ان کا نظامِ حکومت قرآن کے اصولوں کے مطابق نہیں، تو وہاں کے باشندوں کی زندگی کو اسلامی زندگی نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر وہاں نظامِ حکومت تو قرآن کے مطابق ہے، لیکن معاشی نظام اس کے مطابق نہیں، پھر بھی اس زندگی کو اسلامی نہیں کہا جائے گا۔ اس لئے کہ انسانی زندگی کی طرح، دین ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے اختیار کیا جائے گا تو بالکلیہ اختیار کیا جائے گا اور چھوڑا جائے گا تو بالکلیہ چھوڑا جائے گا۔ یہ ہے فرق مذہب اور دین میں۔

قرآن نے جو دین عطا کیا تھا اسے ہماری تاریخ کے صدرِ اول میں متشکل کر کے نوعِ انسانی کو دکھا دیا گیا کہ ان کے لئے

صحیح طرز زندگی کونسی ہے۔ جہاں تک ہیئتِ حاکمیہ کا تعلق ہے، اس نے کہا کہ

(۱) ہر انسان۔ بہ حیثیت انسان ہونے کے۔ واجب التکریم ہے۔ (۱۷/۷۰)

(۲) عزت و تکریم کے مدارج کا معیار تقویٰ ہے نہ کہ نسلی یا دیگر اضافی امتیازات۔ (۴۹/۱۳)

(۳) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنالے۔ (۳/۷۸)

(۴) انسانوں کے باہمی معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ اسی کا نام اندازِ حکومت ہے۔ (۴۲/۳۸)

یہ اصول وہ مستقل اور غیر متبدل اقدار ہیں جن کے مطابق صدر اول میں حکومت قائم ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی قسم کی آمریت یا ملوکیت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ صدر اول میں نہ صرف یہ کہ خود عرب میں قرآنی انداز کی حکومت ہوئی بلکہ) اردگرد کی ملوکیتوں کو بھی ختم کر دیا گیا۔

لیکن تھوڑے عرصے کے بعد مسلمانوں نے اپنی زندگی کی گاڑی کو دوسری پٹڑی پر ڈال دیا اور جن تصورات (Ideologies) اور ادارات (institutes) کو قرآن نے مٹایا تھا، (مثلاً ملوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری وغیرہ) ایک ایک کر کے ان کے معاشرے کا جزو بنتے گئے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

لیکن قرآن نے جو ضابطۂ زندگی دیا تھا اس کی حیثیت "احکام کی نہیں تھی کہ کسی نے مان لیا تو وہ باقی رہے اور جب ان پر عملدرآمد ختم ہو گیا تو ان کی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ وہ زندگی کے غیر متبدل اصول تھے جنھیں بہر حال باقی رہنا اور آگے چلنا تھا۔ چنانچہ یہ آگے چلتے رہے اور جن قوموں نے ذرا بھی عقل و ہوش سے کام لیا وہ رفتہ رفتہ انسانوں کے خود ساختہ ادارات کو چھوڑ کر، قرآن کے تجویز کردہ ادارات کی طرف آتی گئیں (اور آتی جارہی ہیں) مثلاً اسی ایک ملوکیت کو لیجیئے جس کی مثال اوپر دی گئی ہے۔ قرآن نے اسے مٹایا۔ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں نے اسے پھر اختیار کر لیا۔ اور اس طرح ان کے ہاں بھی وہی اندازِ حکومت (بادشاہت) قائم ہو گیا جو دوسری اقوام کے ہاں چلا آرہا تھا۔ رفتہ رفتہ قرآنی تعلیم کے ان اثرات نے جو فضا میں پھیل چکے ہیں اور جن سے انسانی فکر غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ زمانے کے تقاضوں نے دنیا کی ہوشمند قوموں کو سمجھایا کہ یہ اندازِ حکومت غلط ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہاں سے بادشاہتوں کو ختم کر دیا۔ آپ گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کتنے تاج ہیں جو آپ کو فضا میں اُڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن رستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ غیر مسلم قومیں تو زمانے کے تقاضوں کو بھانپ کر اپنے انداز بدلتی گئیں (اور بدل رہی ہیں) لیکن مسلمان ممالک، بادشاہتوں کو اور زور سے سینے سے لگا رہے ہیں (حتیٰ کہ اگر کسی کے ہاں ولی عہد پیدا نہیں ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر ایسی بیوی کی تلاش شروع کر دیتا ہے جس کے ہاں ولیعہد سلطنت پیدا ہو جائے) لیکن ان کی اس قسم کی مذبوحی حرکات سے زمانے کے تقاضوں کے سیلاب تھوڑا رک سکتے ہیں۔

وہ اُمنڈ کر آتے ہیں اور تخت و تاج کو شاہ اور شاہزادہ سمیت بہا کر لے جاتے ہیں۔

لیکن اس باب میں بھی مسلم اور غیر مسلم ممالک میں فرق ہے۔ (اور یہ فرق ہونا ہی چاہیئے) جن غیر مسلم ممالک نے اپنے ہاں بادشاہت کو اپنی مرضی سے ختم کیا، وہاں یہ تبدیلی بغیر کسی کشت و خون اور فتنہ و فساد کے، نہایت آرام اور سکون سے وجود میں آگئی۔ لیکن مسلم ممالک نے چونکہ تخت و تاج ملوکیت کو برضا و رغبت بدلنا نہیں چاہا۔ اس لئے ان سے یہ کچھ زبردستی چھینا گیا۔ اس چھینا جھپٹی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک ملوکیت سے بھی بدتر لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۶/۱۲۹) "اس طرح ہم، ان کی کرتوتوں کی وجہ سے، بعض ظالموں پر دوسرے ظالموں کو مسلط کر دیتے ہیں"۔ یہی کچھ پہلے مصر میں ہوا تھا اور اب عراق میں ہوا ہے۔ ان ممالک میں بادشاہتیں تو ختم ہو گئیں[1] لیکن اس کے بعد وہ جس نئے عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں اس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اس "تیشۂ فرہاد" کا سمجھنا بڑے غور و تدبر کا محتاج ہے، اس لئے کہ جس عذاب کو ہم نے ملوکیت جیسی لعنت سے بھی زیادہ شدید کہا ہے، جب تک اسے اچھی طرح سے نہ سمجھ لیا جائے اس کے انجام و عواقب کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ بالخصوص اس لئے کہ بادشاہت کی خرابیاں ہم مدت سے دیکھتے چلے آئے ہیں اور زمانے کے تقاضوں نے انہیں اور بھی زیادہ اجاگر کر دیا ہے لیکن جس اشد عذاب کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، وہ دورِ حاضر کی پیداوار ہے اور اس کی تباہیاں ہنوز ہماری آنکھوں سے پنہاں ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مسلسل پراپیگنڈہ نے اس جہنم کو اس قسم کا جنت بنا کر دکھایا ہے کہ قوم کا نوجوان طبقہ، جو بالعموم حقائق کے بجائے جذبات کے پیچھے چلتا ہے) اس کی طرف آنکھیں بند کئے کشاں کشاں چلے جا رہا ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اسلام ایک ضابطۂ حیات (دین) کا نام ہے جو زندگی کے خاص فلسفہ پر متفرع ہے۔ یہ فلسفہ آئیڈیلوجی) بھی بے مثل و بے نظیر (Unique) ہے اور ضابطۂ حیات (Code of Life) بھی بلا تسہیم و بلا تحریف۔ اس کے مقابلہ میں (اس سے پہلے) کوئی دین نہیں آیا۔ صرف مذاہب آئے ہیں۔ مختلف مذاہب (مثلاً عیسائیت۔ ہندومت وغیرہ) اپنے اپنے عقائد پیش کر کے اسے دعوتِ مبارزت دیتے رہے ہیں۔ ان نظری عقائد کا زندگی کے عملی مسائل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً امریکن مشنری اگر عرب ممالک میں گئے ہیں تو انہوں نے تثلیث

---

[1] ان سطور کے لکھتے وقت تک عراق کے متعلق یہی اطلاع ہے کہ وہاں بادشاہت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ بدقسمتی سے شاہ عراق کو قتل بھی کر دیا گیا ہے۔

وکفارہ وغیرہ عقائد کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ یہ کبھی نہیں کہا کہ ہمارے ہاں کی جمہوریت کا مقابلہ اپنے ہاں کی ملوکیت سے کرلو۔ اس سے معلوم ہوجائے گا کہ عیسائیت سچا مذہب ہے یا اسلام۔ یہ اس لئے کہ جمہوریت ان کے ملک کا اندازِ حکومت تھا۔ عیسائیت کا جزو نہیں تھا۔

لیکن اس دور میں ایک ایسی "ازم" پیدا ہوئی ہے جس نے ایک "دین" کی حیثیت اختیار کی ہے۔ یہ ہے کمیونزم۔ کمیونزم کا مقابلہ مذاہب سے نہیں ادیان سے ہے۔ اور چونکہ اس وقت دین صرف ایک ہی ہے۔ یعنی اسلام۔ اس لئے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک "ازم" دین کی حیثیت سے ان کے مقابلہ میں اٹھی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس کا بہت کم احساس ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم کا تعلق سیاست سے ہے (یا زیادہ سے زیادہ معیشت سے)۔ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ اس کی حیثیت بالکل ایک "دین" کی سی ہے[1] (یہ دین، دینِ باطل ہی سہی، لیکن اس کی پوزیشن تو دین کی سی ہے)۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ

ایک ضابطۂ حیات ہے جو ایک خاص فلسفہ پر متفرع ہوتا ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہوتا۔

کمیونزم ایک فلسفہ ہے جس پر اس کے ضابطۂ حیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ اور ضابطہ، زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) یہ ممکن ہے کہ ایک عیسائی، جمہوریت کو صحیح مانے اور دوسرا ملوکیت کو۔ اور اس کے باوجود دونوں سچے اور پکے عیسائی متصور ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اشتراکیت کے معاشی نظام کو صحیح مانے اور اس کے ساتھ وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار (Permanent Values) کا بھی قائل ہو اور اسے کمیونسٹ تسلیم کرلیا جائے۔ ایک کمیونسٹ کے لئے صرف اتنا ہی ضروری نہیں کہ وہ روس کے معاشی نظام کو بہتر سمجھے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات پر بھی ایمان رکھے۔ یہ فلسفۂ حیات، اسلام کے فلسفۂ حیات کی یکسر نقیض ہے۔ اسلام کے فلسفۂ حیات کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) انسانی زندگی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی۔ آگے بھی چلتی ہے۔ زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

(۲) ہر عمل کا نتیجہ انسان کی ذات پر پڑتا ہے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اور

(۳) انسانی ذات کی نشوونما زندگی کو اُن مستقل اقدار کے تابع رکھنے سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے خدا کی طرف سے

---

[1] اقبال نے بھی اسے دین کہہ کر پکارا ہے۔ جاوید نامہ میں ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

ملتی ہیں اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔

اس کے برعکس، کمیونزم کے فلسفۂ زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) زندگی اسی جسم کی زندگی ہے۔ اور انسان کے سامنے مسئلہ صرف روٹی کا ہے۔

(۲) جو عمل اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دیتا ہے وہ اچھا ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے، وہ بُرا ہے۔

(۳) خدا۔ وحی۔ مستقل اقدار کا تصور ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ فریب ہے۔

لہٰذا کوئی شخص جو کمیونسٹ ہو وہ کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص مسلمان ہو وہ کبھی کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔

روس کا انداز یہ ہے کہ وہ کسی ملک کو براہ راست کمیونسٹ ہونے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ اس میں بالواسطہ (Indirectly) اپنے اثر و نفوذ کو اس طرح پھیلاتا ہے کہ اس ملک کی فضا غیر شعوری طور پر کمیونزم کے جراثیم سے متاثر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قریب قریب ہر ملک میں (اور مسلمانوں کے ممالک میں بالخصوص) ایک طبقہ ضرور ایسا ہوتا ہے جو موجودہ حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ روس کا طریق یہ ہے کہ وہ اس بیزار (Disgruntled) طبقہ کو خاموشی سے مدد دے کر، ملک کی حکومت کے خلاف ابھارتا ہے اور موقع پا کر اس میں بغاوت کرا دیتا ہے۔ جب یہ نیا طبقہ برسر اقتدار آتا ہے تو وہ خود بخود روس کا حلیف ہوتا ہے۔ اس طرح روس دن بدن اپنے ہم نواؤں کی تعداد بڑھائے چلا جاتا ہے۔ اس سے اس کے دو مقصد حل ہو جاتے ہیں۔ فوری طور پر تو یہ کہ وہ اپنے حریف بلاک (امریکہ) کے خلاف زیادہ سے زیادہ طاقت اکٹھی کرتا جاتا ہے۔ اور آخر الامر یہ کہ اس کے ان حلیف ممالک میں کمیونزم پھیل جاتی ہے۔

روس نے پہلے مصر میں یہی کچھ کیا اور اب عراق میں اسی داستان کو دُہرایا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان ممالک سے بادشاہت کی لعنت کا دفع ہونا بڑی نیک فال ہے۔ لیکن جس طریق سے اور جس مقصد کے لئے یہ کچھ کرایا گیا ہے اسے مسلمانوں کے لئے کسی صورت میں بھی مفید قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سب سے پہلے تو یہ کہ ان ممالک سے ملوکیت کا خاتمہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ روس یا اس کے متبعین کے نزدیک ملوکیت نوعِ انسانی کے لئے لعنت ہے۔ وہاں کے بادشاہوں کو اس لئے الگ کیا گیا کہ وہ روس کے حلیف نہیں تھے جن بادشاہوں کا رجحان اس وقت تک روس کی طرف ہے، روس یا اس کے حلیف ان بادشاہوں کے خلاف کچھ نہیں کرتے انہیں الٹا مدد دیتے ہیں۔ اور جو جمہوریتیں اس کے خلاف ہیں اُن کا تختہ اُلٹ دینے کی فکر دن رات ہوتی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روس ہو یا امریکہ، ان میں سے کوئی بھی کسی دوسرے ملک کا خیر خواہ نہیں۔ ان کے پیشِ نظر مقصد اپنے اپنے اقتدار کا استحکام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ چھوٹے ملکوں کو اپنے ساتھ ملایا جائے۔ اس مقصد کے لئے اگر امریکہ کسی ملک کو کچھ امداد دیتا ہے تو وہ بھی اُس ملک کی بھلائی کی خاطر نہیں۔ اپنے فائدے کی خاطر ہے۔ اور اگر روس کسی ملک میں فساد برپا کر کے وہاں کے بادشاہ کو قتل کرا دیتا ہے تو وہ بھی انسانیت کے کسی بلند نصب العین

کے لئے نہیں اپنے فائدے کے لئے ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ چونکہ روس کی تائید کا نتیجہ یہ ہے کہ مصر اور عراق سے ملوکیت ختم ہو گئی۔ اور ملوکیت کا ختم ہو جانا اسلام کی منشاء کے مطابق ہے، اس لئے روس کا یہ اقدام مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اسلام کی عظمت و صداقت کے لئے ہے، اسی طرح کی خود فریبی یا فریب دہی ہے جس طرح کی خود فریبی یا فریب دہی یہ سمجھنا ہے کہ امریکہ کے دل میں نوعِ انسانی کی ہمدردی کا جذبہ بڑی شدت سے موجزن ہے اس لئے وہ پس ماندہ ممالک کی امداد کرتا ہے۔ روس ہو یا امریکہ، دونوں انسانیت کے یکساں دشمن اور اسلام کے حریف ہیں۔ ان میں سے

ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

اس سے انھیں کوئی غرض نہیں کہ وہ "برّۂ معصوم" بادشاہت کے لباس میں ہے یا جمہوریت کے پیکر میں۔

اس کے بعد دوسرا نقطہ قابلِ توجہ یہ ہے کہ دنیا میں اب آئینی دور ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے ہاں حکومت میں تبدیلی چاہتے ہیں تو انھیں ازخود اس تبدیلی کے لئے چارہ جوئی کرنی چاہیئے۔ کسی خارجی قوت کا دوسرے ملک کے اندر بغاوت پھیلا دینا، کسی صورت میں بھی مستحسن قرار نہیں پا سکتا۔

تیسرے اور سب سے اہم امر یہ کہ اگر سوال صرف بادشاہت کے ختم ہو جانے۔ یا دو بڑی مملکتوں (امریکہ اور روس) میں سے کسی ایک کے ساتھ اور دوسرے کے خلاف ہو جانے تک محدود ہوتا تو اسے اور نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا۔ جب ان ذرائع سے کمیونزم اپنے آپ کو مستحکم کر کے، دوسرے ممالک میں اپنا رنگ جمانے کی فکر میں ہو تو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے صورتِ حالات کا جائزہ لے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اسلامی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کا کمیونزم کے چنگل میں پھنس جانا ایک ایسا عذاب ہے جس سے ان کا چھٹکارا نہیں ہو سکے گا۔ ملوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری کی وہ لعنتیں جن میں مسلمان ہزار برس پہلے ماخوذ ہو گیا تھا، اب زمانے کے تقاضوں سے خود بخود اٹھتی چلی جا رہی ہیں۔ اس لئے ان سے مسلمانوں کی نجات کچھ دنوں کی بات ہے۔ لیکن کمیونزم تو تازہ ترین فتنہ ہے۔ معلوم اسے مضمحل اور افسردہ ہوتے ہوتے کتنا وقت لگ جائے۔ علاوہ بریں، ملوکیت۔ پیشوائیت وغیرہ کے چنگل سے نکل کر مسلمان، اسلام کی طرف ہی آتا ہے۔ دوسرا کوئی مذہب اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر مسلمانوں کی دو چار نسلیں بھی کمیونزم کی زنجیروں میں جکڑی رہیں تو اس کے بعد، اگر کمیونزم کے بند زمانے کے تقاضوں سے ڈھیلے بھی پڑ گئے تو بھی اس کی امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ لوگ دوبارہ اسلام کی طرف آجائیں۔ اسلام اور کمیونزم میں بُعد اتنا ہے کہ ایک کمیونسٹ کا دوبارہ اسلام کی طرف آجانا مستبعد ہے

لہٰذا جو مسلم ممالک اس وقت روس کی مدد یا تائید سے قوت حاصل کر رہے ہیں، انھیں اگر مسلمان رہنا ہے تو اس بیع و شریٰ سے پہلے انھیں ہزار بار سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا خرید رہے ہیں اور اس کی قیمت کیا ادا کر رہے ہیں! انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ

آں خدا نانے دہد۔ جانے دہد　　ایں خدا نانے دہد۔ جانے برد

اور جان دے کر روٹی خرید نا کسی ہوشمند کا سودا نہیں کہلا سکتا۔ کوئی عقلمند انسان سنکھیا پڑے ہوئے پلاؤ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا خواہ وہ کتنے ہی دنوں کا بھوکا کیوں نہ ہو۔

لیکن مسلم ممالک میں روس کی یہ کامیابی، نہ کمیونزم کی جذب و کشش کی وجہ سے ہے اور نہ ہی روس کی کسی بلند سیاست (ڈپلومیسی) کی بنا پر۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ آپ کو معلوم ہے آندھی کس طرح آتی ہے؟ کسی خطۂ زمین میں سخت گرمی ہوا کو ہلکا کر کے اوپر لے جاتی ہے۔ اس طرح اس کی فضا میں خلا پیدا ہو جاتا ہے، اس خلا کو پُر کرنے کے لئے دوسری جگہ سے ہوا نہایت تیزی سے آگے بڑھتی ہے۔ اسے آندھی یا جھکڑ کہتے ہیں۔ کمیونزم کا طوفان بھی بعینہٖ اسی طرح آتا ہے۔ جب کسی ملک میں غربت اور افلاس۔ ناداری اور محرومی۔ بے کسی اور بے بسی اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ تو لوگ یاس و ناامیدی (Frustration) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ارباب اقتدار جو سرمایہ دارانہ نظام سے حامل ہوتے ہیں، مذہب کے علمبردار طبقہ کو آگے بڑھاتے ہیں جو انھیں یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ یہ تمام تکالیف اور مصائب خدا کی طرف سے ہیں اس لئے تم اس کے حضور گڑگڑاؤ۔ اس سے دعائیں مانگو۔ وہ ان مشکلوں کو آسان کر دے گا۔ وہ بیچارے خدا کو پکار کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن ان کی مصیبتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں اب ان کے سامنے زندگی کا کوئی آسرا باقی نہیں رہتا۔ ان کے قلب و دماغ میں ایک گہرا خلا واقع ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا جھکڑ آتا ہے۔ اس لئے اگر مسلم ممالک میں کمیونزم آندھی کی طرح چلی آ رہی ہے تو اس کی ذمہ داری خود ان ممالک کی حکومتوں اور ان کے غیر اسلامی سرمایہ دارانہ نظام پر ہے۔ قرآن نے ایک ایسا نظام دیا تھا جس میں کوئی ذی حیات، کسی صورت میں بھی، ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اس نظام کے بنیادی عناصر یہ تھے کہ

(۱) تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا۔ اور ہر فرد کی ذاتی صلاحیتوں کو تکمیل تک پہنچانے کے اسباب و ذرائع مہیا کرنا، نظام مملکت کی ذمہ داری ہے۔

(۲) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کی بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں تاکہ وہ پیداوار کو خدا کے قوانین کے مطابق، نوع انسانی کی پرورش کے لئے صرف کرے۔

(۳) ہر اس فرد کو جو محنت کرنے کے قابل ہے، اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق پوری پوری محنت کرنی ہوگی

(۴) ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جتنے میں اس کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب نوع انسانی کی پرورش اور بہبود کے لئے، نظام معاشرہ کے حوالے کر دے گا۔ اس طرح فاضلہ دولت (Surplus Money) کسی کے پاس نہیں رہے گی۔ وہ یہ کچھ اسی لئے کرے گا کہ اس کے خدا نے

اسے بتایا ہے کہ اس طرح اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما اور تکمیل مقصودِ حیات ہے۔

(۴) جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ ہوگی تو سلبِ زہب (Exploitation) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس نظام میں نہ زمیندار ہوں گے۔ نہ کارخانہ دار۔ نہ نفع خور تاجر ہوں گے نہ سود خوار مہاجن۔ نہ اکتناز (Hoarding) ہوگا نہ احتکار (Blaek Marketing) اس میں خدا کا عطا کردہ رزق خدا کے بندوں کے لئے عام ہوگا۔ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) "جہاں سے جی چاہے پیٹ بھر کر کھاؤ پیو" وہاں کا معمول ہوگا۔

یہ تھا قرآن کا نظام ربوبیت۔ آپ سوچیئے کہ اگر کسی ملک میں یہ نظام رائج ہو تو اس میں کمیونزم (کا جھگڑا) تو ایک طرف رہا، اس کی ہوا تک بھی آسکتی ہے؟ ہمارے مسلم ممالک بدترین نظامِ سرمایہ داری کی آماجگاہ ہیں جس کی وجہ سے غربت و افلاس وہاں کا معمول بن چکا ہے، اسی غربت و افلاس کی وجہ سے انھیں برطانیہ اور امریکہ کے سامنے جھولیاں پھیلانی پڑتی ہیں اور اسی کی وجہ سے وہاں کمیونزم کا ریلا (واسطہ یا بلاواسطہ) وہ سیلاب آتا ہے۔

جس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

دیگر مسلم ممالک صدیوں سے نظامِ سرمایہ داری کے جذام میں مبتلا تھے۔ ان کا اس سے شفایاب ہونا مشکل تھا (اگرچہ قرآن کے آبِ حیات سے ہر مرض کا علاج ممکن ہے بشرطیکہ مریض میں ہنوز زندگی کی رمق باقی ہو)۔ پاکستان ایک تخلیق تو تھا جو صاف اور سادہ لوح (سلیٹ) لیکر وجود میں آیا تھا۔ اس سے توقع کی جاسکتی تھی کہ یہ اپنے ہاں قرآن کے نظامِ ربوبیت کو رائج کرے گا۔ سچ پوچھئے تو پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اور اس کی تشکیل کا جواز ہی یہ تھا کہ اس میں قرآنی نظام کو قائم کیا جائے گا) لیکن ہماری بدقسمتی کہ صاحبانِ سرمایہ و اقتدار اور ارباب شریعت کی متحدہ کوششوں سے یہ مملکتِ خداداد، اپنی پیدائش کے ساتھ ہی اسی جذام کہنہ کا شکار ہوگئی۔ اور جس طرح ایک دن کا مُردہ اور ہزار سال کا مُردہ برابر ہوتے ہیں، یہ ملک ایک ہی جست میں دیگر مسلم ممالک کے ہم دوش ہوگیا۔ بلکہ اُن سے بھی چار قدم آگے نکل گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جس خلا کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ یہاں اور بھی زیادہ شدت اور گہرائی سے پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس وقت ہمارے معاشرہ کی حالت یہ ہوچکی ہے کہ اسے نہ زندگی کی مستقل اقدار سے کوئی واسطہ رہا ہے نہ اصولِ حیات سے کوئی تعلق۔ نہ ان کے سامنے کوئی ملی نصب العین ہے نہ اجتماعی مقصدِ زندگی۔ آبادی کا ایک مختصر (نہایت مختصر) طبقہ لوٹنے میں مصروف ہے اور باقی کثیر تعداد زندگی کی ابتدائی ضروریات تک سے محتاج اور بہت بری طرح سے محتاج۔ اُن کے سامنے روٹی کے سوا کوئی اور مسئلہ نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی کے سامنے خدا کا نام لیا جائے تو وہ نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہہ دیتا ہے کہ ہم نے دس سال تک خدا کو بھی آزما کر دیکھ لیا ہے۔ وہ بھی امیروں ہی کی سنتا ہے۔ غریبوں کی نہیں سنتا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو بھی ان کی روٹی کا مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کرے گا یہ

اس کی طرف جھک جائیں گے۔ لہٰذا اردن ہو یا عراق۔ ایران ہو یا پاکستان۔ ان سب ممالک میں وہ خلا پیدا ہو چکا ہے، اور عراق میں جو کچھ ہوا ہے، وہ درحقیقت پیش خیمہ ہے اُس کا جو باقی (اسی قسم کے ممالک ہیں) کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک حالات کا بے لاگ تجزیہ۔ ہم ان حضرات سے جو دل میں کچھ بھی اسلام کا احساس اور ملت کا درد رکھتے ہیں، پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان حالات میں ان کا فریضہ یہی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے خاموشی سے دیکھتے جائیں اور اگر ملک کمیونزم جیسے طوفانِ بلا میں مبتلا ہے تو اسے بہنے دیں؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تو کیا آپ پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ اس سیلاب کو روکنے کے لئے پختہ سا بند بنایا جائے!

کمیونزم کو روکنے کے لئے سوائے قرآنی نظام ربوبیت کے اور کوئی بند نہیں ہو سکتا۔ اس دینِ باطل کا صرف قرآن کا دینِ حق ہی مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ابھی موقع ہے کہ اس نظام کو رائج کر کے ملک کو کمیونزم کے جہنم میں گرنے سے بچا لیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے لئے ہم اور آپ کیا کریں؟ اس سوال کا جواب آسان ہے۔ ہمارا ملک آئینی اور جمہوری ہے۔ اس میں ہر تبدیلی آئینی اور جمہوری انداز سے لائی جا سکتی ہے۔ آئینی اور جمہوری طور پر تبدیلی لانے کے لئے ضروری ہے کہ جس تبدیلی کو آپ لانا چاہتے ہیں اس کے تصور کو فضا میں عام کیجئے۔ طلوع اسلام، اپنی بساط کے مطابق، برسوں سے قرآنی نظام ربوبیت کے تصور کو عام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے ذرائع محدود ہیں۔ بہت ہی محدود۔۔۔ واضح رہے کہ طلوع اسلام نہ کسی پارٹی کا آرگن ہے نہ کسی مذہبی فرقہ کا ترجمان۔ اس کے پاس نہ اپنے فنڈز ہیں نہ ہی اسے کہیں سے ایک پائی کی امداد ملتی ہے۔ لہٰذا اس کے ذرائع کے محدود ہونے میں کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ جو علاج طلوع اسلام نے بتایا ہے اگر آپ اس سے متفق ہیں تو کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اس فکر کو عام کرنے میں خود کوشش کیجئے یا اس کا ہاتھ بٹایئے لیکن اسے نہ بھولئے کہ یہ وقت سہل انگاری کا نہیں۔ زمانے کی رَو برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے اور کمیونزم اور اس کے مضمرات کی فساد انگیزیاں ہمارے دریاؤں کی برساتی طغیانیوں سے بھی زیادہ تیزی سے امنڈے چلی آ رہی ہیں۔ لہٰذا اربابِ درد واحساس کو اگر کچھ کرنا ہے تو بہت جلد کرنا ہوگا۔ اس وقت تھوڑا سا تساہل و تغافل یا تامل و توقف بھی ہمارے لئے مہلک ثابت ہوگا۔

جس نے اس ضمن میں کچھ کرنا ہے اسے یہ بھی سمجھ رکھنا چاہیئے کہ اس وقت ہمارے ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اگر کوئی شخص اتنا بھی کہہ دے کہ غریب بھوکے مر رہے ہیں۔ ان کی روٹی کا کوئی انتظام ہونا چاہیئے، تو مذہب پرست طبقہ شور مچا دیتا ہے کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ ناصر جو کچھ کر رہا ہے اس کا انجام مسلمانوں کے لئے اچھا نہیں ہوگا تو نوجوان طبقہ (Hooting) شروع کر دیتا ہے کہ یہ امریکہ کا پٹھو ہے۔ برطانیہ کا زرخرید ہے۔ لہٰذا جو شخص کمیونزم کی روک تھام کے لئے نظام ربوبیت کی آواز بلند کرے گا، قدیم و جدید دونوں طبقوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی۔ حتیٰ کہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے بھی اس کی مخالفت ہوگی۔ اس لئے کہ یہ بلاک اسے بھی پسند نہیں کرتا کہ اُن کے حلیف ممالک ایسے خوش حال

ہوجائیں کہ انھیں ان کی امداد کی ضرورت نہ رہے۔ وہ نہ انھیں اتنا بھوکا رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ بھوک کی شدت سے تنگ آ کر کسی دروازے پر دستک دینا شروع کردیں اور نہ ہی ایسا فارغ البال دیکھ سکتے ہیں جس سے یہ اُن کی دست نگری سے مستغنی ہو جائیں۔ وہ قصاب کی طرح بکرے کو گھاس دانہ بھی دیتے ہیں کہ وہ کہیں مر نہ جائے اور گلے میں رسی بھی ڈالے رکھتے ہیں کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس لئے جو شخص قرآنی نظام ربوبیت کا پیغام لے کر اُٹھے اسے مرحلہ کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس وقت ہم اہلِ پاکستان بڑے ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی حفاظت کے لئے پوری ہمت اور جانفشانی سے کام نہ لیا تو زمانے کا ریلا ہمیں کچل کر رکھ دے گا اور

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔

پیش کش برائے طباعت لغات القرآن

۲۱ر جون سے ۲۱ر جولائی تک جو عطیات موصول ہوئے ہیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

انفرادی

(۱) محمد خلیل اللہ صاحب ٹنڈو آدم۔ 10-·-·
(۲) ماسٹر علی اکبر صاحب کنری 50-·-·
(۳) فضل کریم صاحب مردان 75-·-·
(۴) کراچی کے ایک قرآنی دوست 5-·-·
(۵) جمال الدین خاں صاحب میاں چنوں 100-·-·
(۶) لاہور کے ایک قرآنی دوست 400-·-·

640-·-·

بزمہائے طلوع اسلام

(۱) شیخوپورہ 25-·-·
(۲) ڈیرہ غازی خاں 50-·-·
(۳) سیالکوٹ 500-·-·
(۴) دیونہ منڈی 125-·-·
(۵) لاہور 93-·-·

793-·-·

میزان کل:-

	وعدے	رقم موصولہ تا ۲۰ر جون	رقم موصولہ تا ۲۱ر جولائی	کل موصولہ رقم
بزمیں	28,041-·-·	13,716-·-·	793-·-·	14,509-·-·
انفرادی	23,394/8/-	21,282-3-·	640-·-·	21,922-8-·
میزان	51,435-8-·	34,998-8-·	1433-·-·	36,431-8-·

مذاکرہ عالم اسلامی (لاہور)

اسلامی مملکت کا تصوّر

از ڈاکٹر یحییٰ الخشب۔ پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی (مصر)

جب ہم اسلامی مملکت کے تصور کا ذکر کرتے ہیں تو قرآن ہی کو اس تصور کا ماخذ مان کر کرتے ہیں۔

قرآن مذہبی قوانین کے علاوہ دنیاوی قوانین کا مجموعہ ہے اور مجموعۂ قوانین کا مقصد جہاں مسلمانوں کی زندگی کی رہنمائی کرنا اور ان میں تنظیم پیدا کرنا تھا وہاں مملکت کے اندرونی انتظام اور خارجہ کے بارے میں بھی ہدایات دینا تھا۔ جب ہم قرآن کو ان تمام امور کا رہنما قرار دیتے ہیں تو ان امور کے بارے میں قوانین کے اس طریق اطلاق کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے لامحالہ ہماری نگاہ رسول اکرمؐ کی طرف اٹھتی ہے اور ہم روایت یا سنت کا بیان کرتے ہیں۔ وہ روایت و سنت جو پیغمبر اسلام کا اور خلفائے راشدینؓ کا طریق کار تھا جسے بعد کے خلفاء نے اپنایا۔

رسول اکرمؐ کی زندگی میں صرف قرآن ہی قانون کا کام دیتا تھا۔ اس کے قوانین پر بڑی احتیاط سے عمل کیا جاتا تھا کیونکہ نئے نئے مذہب کا نیا نیا قانون تھا۔ جب کبھی عربوں کو کوئی مشکل پیش آتی تو وہ آپؐ کے پاس آتے۔ آپؐ ان کی مشکلات حل کرتے اور صحیح فیصلہ دے کر سیدھی راہ بتاتے تھے کہ ایسے مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہیئے۔

قرآن مملکت کی تعمیر چند بنیادی اصولوں پر کھڑی کرتا ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ الشوریٰ (یعنی مسلمانوں کی باہمی مجلس مشاورت) یہ حکومت کا بنیادی اصول ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ الشوریٰ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "جو خدا کے ارشاد پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کی عبادت باقاعدگی سے کرتے اور معاملات باہمی صلاح و مشورے سے نبٹاتے ہیں"۔ حق تعالےٰ نے پیغمبر اسلام کو مومنین سے مشورہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ "اس لئے انہیں معاف کر دو اور اللہ کے ہاں ان کی شفاعت کرو۔ اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو"۔ جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپؐ صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے اس کی کئی شہادتیں موجود ہیں مثلاً جنگوں کے موقعہ پر۔ جیسا کہ غزوۂ احد میں ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام قرآن کی ہدایت پر کس شدت سے

عمل کرتے تھے اور صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ الشوریٰ صرف اسلامی مملکت یا سماج اور سوسائٹی کا بنیادی اصول ہی نہیں بلکہ اسے جدید اصطلاح میں حقیقی و آئینی جمہوریت بھی کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں میں بھائی چارے اور مساویانہ حقوق کا اصول۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رکھو اور نفاق میں مت پڑو۔ اللہ کی اس رحمت کو یاد کرو جس نے تم سب کو جبکہ تم ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے باہم ایک کر دیا اور تم سب بھائی بھائی بن گئے۔" سورۃ الحجرات میں فرماتے ہیں "صرف مسلمان ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" اسی طرح بھائی چارے کے متعلق کئی آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ تمام اسلامی ممالک کے مسلمان اس حدیث سے باخبر ہیں کہ مسلمان کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں اور اس بارے میں بھی کئی حکایات ہیں مثلاً کس طرح پیغمبر اسلام نے (حضرت) سلمان سے جو ایرانی تھے اور (حضرت) بلال سے جو حبشہ کے رہنے والے تھے اور دونوں جنگی قیدیوں کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے کیسی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا اور "ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم" مسلم سوسائٹی صرف ایک ہی اصول پر کاربند تھی: "خدا کی نگاہ میں صرف متقی و پرہیزگار ہی قدر و منزلت کا مالک ہے۔"

یہی مساویانہ حقوق اور طبقاتی تقسیم کی نفی کا اصول ہی تو تھا جس نے ایران کی فتح میں سب سے زیادہ ہاتھ بٹایا۔

ایرانی قوم چار طبقوں میں تقسیم تھی، اور مزدوروں یعنی کسانوں کی طرح پست طبقہ والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے کا خیال بھی دل میں لائیں۔ پست طبقہ کا ایک فرد خواہ کتنا ہی امیر یا فہم و ادراک کا مالک ہو وہ ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام عمر اسے اپنے ہی طبقہ سے متعلق رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے ایرانی عوام دھڑا دھڑ اسلام کے دامن میں پناہ لینے لگے کیونکہ ان کے خیال میں اسلام ان کے مذہب سے ہزار درجہ بہتر تھا جو سوسائٹی میں مساوی حقوق کا علمبردار تھا۔

۳۔ عوام میں دولت کی مساویانہ تقسیم کا حکومت کے فرائض میں داخل ہونا

اور قرآن بخل (MISERLINESS) کے سخت خلاف ہے اور اسے قابل نفرت فعل سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے امیروں پر یہ فرض قرار دیا کہ وہ اپنے نفع سے جو منافع ان کو ان کے مال پر دستیاب ہے خدا کی راہ میں خرچ کریں۔ "جو دولت جمع کرتے ہیں اور دوسروں کو ان کا حق نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انہیں اپنے خزانے سے عطا کیا ہے اسے چھپا کر رکھتے ہیں۔ ان کے لئے آخرت ذلت کا مقام ہے۔" "وہ لوگ جو اللہ کے خزانے سے کچھ پاتے ہیں اور اسے جمع کر کے رکھ چھوڑتے ہیں یہ خیال نہ کریں کہ یہ مال انہیں نفع پہنچائے گا ہرگز نہیں بلکہ وہ خسارے میں رہیں گے اور قیامت کے روز یہ مال ان کے خلاف شہادت دے گا۔"

"وہ لوگ جو سونے اور چاندی کو چھپا کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اے محمد! انہیں عذاب الیم کی خبر دے اور اس دن کی خبر دے جبکہ یہ سونا چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کئے جائیں گے اور ان کی پیشانی [illegible] اور پیٹھ ان سے داغی جائے گی اور پھر ان سے کہا جائے گا۔ یہ وہی ہے اس کو اپنے واسطے جمع کیا کرتے تھے اور اب اپنے جمع کئے کا مزہ چکھو۔" سورۃ

محمد صلعم میں بھی اسی مضمون کی آیات ہیں (آیہ نمبر ۳۸)۔ عملی زندگی میں ہم خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی کافی مثالیں پاتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ رسول اکرمؐ کی زوجۂ محترمہ اور حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم خدا کی راہ میں فراخدلی سے خرچ کیا کرتے تھے۔ "خبردار! تم ایسے لوگ ہو جنھیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے پھر تم میں سے کچھ ایسے افراد ہیں جو بخل کرتے ہیں، یاد رکھو جو بخل کرتا ہے وہ خود اپنی ذات (کی نشو و نما) سے بخل کرتا ہے۔ اللہ (تمہارے مال سے) بے نیاز ہے تم ہی ضرورتمند ہو"

۲- الزکوٰۃ :- قرآن نے ہی مملکت کی خاطر مستقل ٹیکس کا قانون بنایا اور اہم بات یہ ہے کہ یہ اسلام کے پانچ ارکان میں بھی شامل ہے۔ زکوٰۃ کے حکم کے بارے میں کئی آیات قرآن مجید میں آئی ہیں۔ اور عملی زندگی میں ہمیں حضرت ابوبکرؓ صدیق خلیفہ اول کی مثال بھی ملتی ہے جنھوں نے الردہ کی جنگ ان لوگوں کے خلاف لڑی جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا تھا حضرت ابوبکرؓ نے ان کو سبق سکھا دیا کہ زکوٰۃ جیسے عوامی بھلائی کے معاملات میں رخنہ ڈالنے یا ان پر عمل کرنے سے انکار کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟۔

زکوٰۃ یعنی عوامی ٹیکس اور دوسرے تمام آمدنی کے ذرائع مثلاً مال غنیمت کا خمس، جنگ کے بغیر حاصل کیا ہوا مال یعنی الفئی، جزیہ جو غیر مسلم ادا کرتے ہیں اور وہ تمام دولت جو امراء اپنی مرضی سے خیرات کے طور پر دیتے ہیں۔ یہ تمام سرمایہ عوام کی بہبود کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ جدید زمانہ کی اصطلاح میں ہم اسے یوں بیان کرسکتے ہیں کہ حکومت عوام کی بہتری اور تحفظ کے لئے سرمایہ کے اسٹاک کو ختم کرنے کے لئے امراء سے ٹیکس وصول کرتی ہے۔

غریب و نادار غیر مسلموں سے جزیہ نہیں لیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے بھی ان سے کبھی جزیہ نہیں لیا۔ بلکہ ان کی امداد کی، جدید اصطلاح میں اسے سماجی تحفظ (SOCIAL INSURANCE) کہتے ہیں۔ یعنی سوسائٹی کے ہر حاجتمند کی امداد کرنا حکومت کا فرض ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے جس پر وہ ابتدائی زندگی ہی سے عمل پیرا تھا۔

۳- خاندان کا تحفظ

قرآن نے ایک خاندان کے لئے بھی باقاعدہ نظام مقرر کیا ہے۔ شادی زندگی کا سودا ہے اور طلاق صرف اس وقت جائز ہے جب میاں بیوی کے تعلقات قائم رکھنا ناممکن ہو جائے۔ ہر شخص اقرار کریگا کہ خدا طلاق کی اجازت دیتا ہے لیکن اسے ایک قابل نفرت فعل بھی قرار دیتا ہے[۱]۔ بیوی پر ظلم کرنا جائز نہیں بلکہ وہ برابر کے حقوق اور انصاف کی حقدار ہے۔ ایک مرد پر جو جو عورتیں حرام ہیں ان کا ذکر صراحت سے کردیا گیا ہے۔

ان اصولوں کا عملی زندگی میں یہ نتیجہ نکلا کہ عرب یا مسلم سوسائٹی دوسری سوسائٹیوں سے مختلف ہوگئی۔ کیونکہ شادی کی دوسری مضرت رساں اقسام سے اسے نجات مل گئی۔ اس لئے کہ اسلام نے قریبی رشتہ میں جو عورتیں

---

[۱] خدا نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ اس نے طلاق کے لئے قاعدے اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں اور جب طلاق ان قواعد و ضوابط کے مطابق دی جائے گی تو وہ عین احکام الٰہی کے مطابق ہوگا۔ اس لئے اسے قابل نفرت فعل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ (طلوع اسلام)

ہوں ان سے شادی ممنوع قرار دی۔[1] بیوی اور باندی[2] کے حقوق مقرر کر دیئے اور خلع کے مسئلہ کا بھی جب کہ ایک عورت مرد کو چھوڑنا چاہے حل پیش کر دیا۔

خاندانی معاملات کو مضبوط اسماجی بنیادوں پر استوار کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اولاد اپنے بزرگوں کو پہچاننے لگی۔ باپ بیٹے کے تعلقات مضبوط ہو گئے چونکہ ان قوانین نے ایک خاندان کو مضبوط و مستحکم کر دیا تھا اس لئے شادی کی وجہ سے جب مختلف خاندان ایک دوسرے سے ملے تو سوسائٹی کی بنیادیں اور پائدار و مستقل ہو گئیں۔

دوسری اقوام میں اس وقت بہت ہی مضرت رساں قوانین رائج تھے جن کی رو سے ایک بچے کا باپ ناجائز ہونا یا کسی کو اس کے بارے میں علم ہی نہ ہونا یا بیویوں کو منڈی کی جنس سمجھ کر تبادلے کے لئے پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن جب اسلام کے قوانین اور اس کے نتائج ان کے سامنے آئے تو وہ اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔

۵۔ تنظیم المعاملات یعنی قرآن و سنت کے قوانین کی روشنی میں مختلف امور کی تنظیم اور فیصلہ کرنا۔ بعض اسلامی ممالک میں دیوانی قوانین کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین بھی رائج ہیں۔ لیکن بعض اسلامی ملکوں میں صرف قانون الٰہی کا راج ہے۔ ماہر قوانین جب دونوں قوانین کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ تو اسلامی قوانین ہی کی مدح و ستائش کرتے ہیں۔ اگر ہم قدیم قوانین میں سے رومن و ایرانی قانون کا اسلامی قانون سے مقابلہ کریں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اسلام نے کس طرح سلطنت کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے اور یہ کہ تمام متنازعہ فیہ امور میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی وہ کس طرح عملاً مفید ثابت ہوتے ہیں۔

ہم اس معاملہ میں حضرت عمرؓ کی مثال دے سکتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے مختلف علاقوں کے گورنروں کو مقامی جھگڑے نبٹانے کی ہدایت کی۔ اور اسلامی قانون کے ان ماخذ کا ذکر بھی اس مرحلے پر غیر موزوں نہ ہوگا جو مقامی لوگوں کے تنازعات کے بارے میں اصول پیش کرتے ہیں۔

۶۔ بین المملکتی معاملات کی بنیاد نظریۂ امن پر اسلام بین المملکتی امور کے بارے میں یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جو تم سے جنگ مول لینے میں پہل نہیں کرتا یا جو تم سے برسر پیکار نہ رہا ہو اور تمہیں تمہارے وطن اور گھروں سے نہ نکالا ہو۔ اس سے نہ لڑو۔

"اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں سے جنگ نہ کرنے کا حکم دیتا ہے جو اختلاف مذہب کی وجہ سے تم سے نہیں لڑتے اور تمہیں

---

[1] صرف انہی قریبی رشتہ کی عورتوں سے جن کی حرمت قرآن نے بیان کر دی ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] باندیوں کے احکام اُس دور سے متعلق ہیں جب ابتدائے اسلام میں عربوں کے ہاں باندیاں ہوتی تھیں۔ قرآن نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ (طلوع اسلام)

تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے یا جو ایسے معاملات میں امداد نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے ساتھ محبت و شفقت اور انصاف کی تلقین کرتا ہے اور اللہ انصاف کرنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔"

"البتہ جنھوں نے تم سے جنگ کی اور تمہیں ہجرت کرنے پر مجبور کیا ان سے نرمی کی اجازت نہیں ہے اس لئے کہ ان کو دوست بنانا ہے وہ غلط راستے پر چلنا ہے۔" پھر ارشاد ہوتا ہے۔ "ہاں اگر وہ امن کی خواہش کریں تو تم بھی امن کو پسند کرو۔" اس اصول کو جدید دور میں "دشمنوں سے کھلی دشمنی اور دوستوں سے بے لاگ دوستی" کہتے ہیں۔

جب اسلامی سلطنت بہت وسیع ہوگئی تو دور دراز علاقوں اور کثرت آبادی کی وجہ سے یہ مشکل ہوگیا کہ لوگ اپنے رہنما یا خلیفہ خود چنیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلافت وراثت میں تبدیل ہوگئی[1]۔ اور ہر ملک کا حاکم خلیفہ بن بیٹھا جیسے کہ شام میں بنی امیہ، بغداد میں عباسی، مصر میں فاطمی اور اسپین میں امیہ خلافت۔ یہ سب تقریباً ایک ہی وقت میں برسر اقتدار آئیں۔ وسعت مملکت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کو دوسری مفتوحہ اقوام سے وزارت کے سسٹم کو بھی اپنانا پڑا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے بنیادی اصولوں کو زد سے باہر رکھتے ہوئے ہر طرح زمانے اور جگہ کے مناسب اپنے آپ کو ڈھال سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ جزئی قوانین میں ترامیم کر سکتا ہے[2]۔ اسلام کے بنیادی اصول جن کی حفاظت ضروری ہے اس کے سوا کچھ نہیں جو واضح طور پر قرآن و سنت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

مسلم تہذیب نے جس کی بنیاد قرآن پر رکھی گئی تھی بڑی آسانی سے ایرانی، یونانی اور ہندوستانی تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اسلامی تہذیب ہی تھی جس نے ترجموں کے ذریعے یونانی عقائد کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اور مترجمین زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ اسلامی ممالک کی لائبریریاں، مکاتب، یونیورسٹیاں مثلاً الازہر یہ تمام اس بات کی شاہد ہیں کہ اسلام نے ہمیشہ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کو مسلم تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہونے[3] اور اثر قبول کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اسلامی تہذیب میں علم سے محبت عالموں کی قدر اور علم حاصل کرنے کی ہوس، یہ تمام عناصر نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ اور پیغمبر اسلام کا یہ فرمان کہ "علم کی قدر کرو اور اگر وہ چین میں بھی ملے تو اسے حاصل کرو" ہر موقع پر دہرایا جاتا اور حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ وہ اہم اصول ہیں جن کی بنیاد پر مسلمانوں نے دنیا کی عمارت تعمیر کی۔ ان مذہبی قوانین میں سے قیاس نے اس کی تعمیر و ترقی میں بہت کام کیا۔ الشوریٰ، مساویانہ حقوق، ہر شے کی مناسب تقسیم، تمدنی تحفظ، انفرادی و اجتماعی معاملات کے قوانین، بین المملکتی اصول، علمی کارکردگی کی ستائش و قدر۔ اور جہاں سے بھی علم کا خزانہ ملے اس کو حاصل کرنے کا جذبہ۔ یہ ایسے اصول ہیں جو ایک صحت مند اور اعلیٰ اقدار کی حامل مملکت کے لئے ضروری ہیں اور اسلام نے اپنی مملکت کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی تھی۔

---

[1] خلافت کے وراثت میں تبدیل ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی مملکت کا رقبہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی کچھ کم وسیع نہیں تھا۔ (طلوع اسلام) خلافت کو وراثت بنانا جزئی قانون کی ترمیم نہیں دین کے بنیادی اصول کی تنسیخ ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] جب تک اس نکتہ کی وضاحت نہ ہو جائے کہ تہذیب کسے کہتے ہیں اور اسلامی تہذیب کیا ہے اس وقت تک یہ بحث درست نہیں ہو گی کہ اسلام نے غیر مسلم تہذیبوں کو اسلامی تہذیب پر اثر انداز ہونے کی اجازت دے رکھی ہے۔ (طلوع اسلام)

سلیم کے نام

غلامی سے بتر ہے بے یقینی

یہ درست ہے سلیم! کہ ہمارے معاشرے کی آج حالت یہی ہو چکی ہے کہ

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

لیکن چیچک کے علاج کے لئے ایک ایک آبلے پر پھاہا نہیں رکھا جاتا۔ جسم کے اندر ایک (جراثیمی) خرابی ہوتی ہے اس کا علاج کر دیا جائے تو تمام زخم خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی ایک ایک خرابی کا الگ الگ علاج نہیں ہوگا۔ اس کے مرکزی بگاڑ کا علاج ہوگا جس سے یہ لاتعداد خرابیاں جن کی کثرت ہمیں آج اس طرح ڈرا رہی ہے کہ ہم ان کے علاج کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ مرکزی بگاڑ کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اس لئے کہ اگر اس کی صحیح تشخیص ہو جائے تو پھر مرض کا علاج چنداں مشکل نہیں ہوگا۔

مرکزی بگاڑ کے متعلق بھی میں تمہیداً ابھی کہونگا کہ

تفصیلِ معنیٔ غمِ الفت طویل ہے۔ اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے۔

میرے نزدیک بگاڑ کے اس مرکزی نقطہ کے متعلق مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہماری قوم اپنے ظاہر و باطن میں بعید تضاد کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس سے اس کے تشخص (personality) میں تشتت و انتشار (Disintegration) واقع ہو گیا ہے۔ اس تشتت و انتشار کو منافقت یا (Dual Personality) کہتے ہیں۔ یاد رکھو سلیم! ایمان (اسلام) بھی اپنے نتائج رکھتا ہے۔ اور کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے۔ لیکن منافقت کا نتیجہ

فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ تصور و خیال کا فریب۔ عمل و کردار کا فریب۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب زندگی یکسر فریب ہو جائے تو پھر کونسا گوشۂ حیات ہے جو تعمیری نتائج کا حامل ہو سکتا ہے؟ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم جو کچھ زبان سے کہتے ہیں اس پر ہمیں دل سے یقین نہیں اور جو کچھ ہمارے دل میں ہے اسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں۔ نتیجہ اس کا وہ اطمینان سوز جہنم ہے جس میں ہم من حیث القوم مبتلا ہیں اور جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ آؤ مجتبیٰ دو ایک مثالیں دیکر سمجھاؤں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا مطلب کیا ہے۔ غور سے سننا کہ یہ بڑی اہم حقیقت ہے جس کے متعلق غالباً میں پہلی بار تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔

معیارِ قومیت

ہم نے اوائل بیسویں صدی سے یہ کہنا شروع کیا کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

یہاں تک کہ تہذیبِ حاضر نے جو بُت تراشے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

لہٰذا۔

اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ہماری ہمدردیاں کبھی ہندوستان کی چاردیواری کے اندر لبسنے والے مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رہیں۔ یہ ہمیشہ حدود فراموش اور قیود نا آشنا رہیں۔ ہماری حالت یہ تھی کہ طرابلس کے ریگ تانوں میں کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھا اور ہماری آنکھ کے آبگینہ میں خون چھلک پڑا۔ ایران کے لالہ زاروں میں کسی فرزندِ توحید کی توہین ہوئی اور ہم پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ سمرنا میں کوئی ترک خاتون بیوہ اور اس کا بچہ یتیم ہو گیا تو ہم نے آہِ نیم شبی اور نالۂ سحرگاہی سے آسمان تک کو ہلا دیا۔ تم اُس زمانے میں بچے تھے ورنہ جب یونانیوں نے ترکوں پر حملہ کیا اور ترک موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہو گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں نے جس کرب و اذیت سے چیخ و پکار کی تھی، اگر تم نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا تو تم اس کی شہادت دیتے کہ جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے وہ "شاعری" نہیں۔ ایک حقیقت کا بیان ہے۔

غرضیکہ ایک مُدت تک ہماری یہی حالت رہی کہ ہم نے اسلام کی عالمگیر برادری کے راستے میں وطن کی چاردیواری کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعوے پر رکھی گئی کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیلوجی کی یکسانیت (دین) ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں تھی۔ یہ اُن کی مدتوں کی جانی پہچانی ہوئی آواز تھی جو عرصۂ دراز سے ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضائے عالم کو مرتعش کرتی چلی آ رہی تھی۔

کامل دس برس تک ہم قرآن کے اس پیغامِ عظیم کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچاتے رہے کہ اسلام میں قومیت کی تشکیل دین کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ وطن۔ نسل۔ رنگ۔ زبان کے اشتراک سے نہیں ہوتی۔ یعنی اسلام کی رُو سے ہندو ہما

اور مراکش میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں اور ایک شہر میں رہنے والے مسلم اور غیر مسلم دو مختلف قوموں کے افراد۔

دس برس کی اس پیہم پکار کے بعد ہمیں پاکستان مل گیا۔ لیکن پاکستان ملنے کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے ایسی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں جو اس امر کی صاف غمازی کرتی تھیں کہ معیار قومیت کے متعلق جو کچھ ہم دس برس سے مسلسل کہتے چلے آرہے تھے، اس پر ہمیں یقین نہیں تھا۔ وہ ہمارے دل کی آواز نہیں تھی۔ لیکن ہم اس کا کھلے بندوں اعتراف نہیں کرتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے قول اور عمل میں تضاد واقع ہونا شروع ہو گیا۔ مثلاً ہم زبان سے افغانی۔ ایرانی۔ عراقی۔ نجدی شامی مصری مسلمانوں کو اپنا بھائی اور ایک برادری کے افراد کہتے تھے لیکن عملاً ان پر پاکستان کی شہریت (Citizen ship) کے دروازے بند کر رہے تھے اس کے برعکس، ہم پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو مسلم قومیت کے دائرے سے باہر بھی قرار دے رہے تھے اور اس کے ساتھ انھیں پاکستانی قومیت کے پورے حقوق بھی دیئے جا رہے تھے۔ یہ اسی دو دلی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ انتخابات جداگانہ ہوں گے اور دوسری طرف ہم مجالس قوانین ساز میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے۔ مختصراً یہ کہ اس دس سال میں حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جو اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہو کہ مسلمانوں میں قومیت کا مدار اشتراک دین ہے اشتراک وطن نہیں۔ لیکن اس کی جرأت بھی شاید ہی کسی کو نصیب ہو کہ وہ اپنے اس عقیدے کا کھلے بندوں اعلان کر دے۔

اس داخلی کشاکش کا سب سے زیادہ مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ ہم پاکستانی نہ تو قرآن کے بلند آئیڈیل کے مطابق ایک عالمگیر مسلم قوم بن سکے ہیں اور نہ ہی نیشنلزم کے عام تصور کے مطابق، پاکستان کے حدود کے اندر ایک قوم کے پیکر میں ڈھل سکے ہیں۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اگر کسی مملکت میں سات آٹھ کروڑ نفوس محض افراد کی حیثیت سے بستے ہوں اور وہ قومیت کے (بلند قرآنی۔ یا پست، وطنی) تصور کے ماتحت ایک قوم نہ بن سکے ہوں تو اس مملکت کی حالت کیا ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں قومیت کی اجتماعی زندگی کا شعور ہی موجود نہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو کبھی ایک قوم کا جزو محسوس نہیں کیا۔ ہم سب انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی لئے ہمارے سامنے انفرادی مفاد سے بلند کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ نہ چھوٹے کے سامنے نہ بڑے کے نہ ادنیٰ کے سامنے نہ اعلیٰ کے۔ نہ غریب کے سامنے نہ امیر کے نہ افسر کے سامنے نہ ماتحت کے۔ نہ مسٹر کے سامنے نہ مولانا کے۔ نہ دیانتدار* کے سامنے نہ بددیانت کے۔ جب تک ہم میں قومی شعور بیدار نہیں ہوتا، پاکستان کی فلاح و بہبود کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی۔ ملک کے چند افراد یا خاندانوں کا بیحد دولتمند ہو جانا، اور ہوتے چلے جانا، ملکی بہبود کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔

اس انتشار (Chaos) سے نکلنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ اگر ہم مسلمان کی زندگی جینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر یقین ہونا چاہیئے کہ مسلم قومیت کا معیار اشتراک دین ہے۔ اور ہمیں اس معیار کے مطابق ایک امت ایک ملت بننا ہے۔

---

* ہماری دیانتداری مستقل اقدار کے اتباع کی تو کجا، قومی مفاد کے جذبہ کی پیدا کردہ بھی نہیں ہوتی۔ محض طبعی افتاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کو دیانتداروں کی نااہلی اور غلط نگہی سے بھی اس قدر نقصان پہنچ رہا ہے جس قدر بددیانتوں کی بددیانتی سے۔

اور اگر ہم اس پر یقین نہیں رکھتے کہ قومیت کا معیار اشتراکِ دین ہے تو ہمیں کھلے بندوں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے اور اشتراکِ وطن کی بنا پر پاکستان کے حدود میں بسنے والوں کو ایک قوم کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سے اگر ہم امتِ مسلمہ یا ملتِ اسلامیہ نہیں بن سکیں گے تو (کم از کم) دنیا کی دوسری قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل تو ہو سکیں گے۔ یہ حالت بہر حال، ہماری موجودہ حالت سے بہتر ہوگی۔ ہم اسلام کی جنت تک نہیں پہنچ سکیں گے (اور یہ ہماری انتہائی بدبختی ہوگی) لیکن منافقت کے جہنم کے درکِ اسفل سے تو نکل جائیں گے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا۔ (۴/۱۴۵) قرآن نے منافقین کا مقام جہنم کا درکِ اسفل (سب سے نچلا درجہ) بتایا ہے۔ اور اس کی شہادت خود ہماری حالت دے رہی ہے جس میں قیامت امروز اور جہنم موجود کے دیکھنے کو ہمیں ہر جا ملتے۔

یاد رکھو! اسلیم۔ میں یہ کچھ ملک کے ان لوگوں کے متعلق کہہ رہا ہوں جو اسلام کی حقانیت اور اس کے اصولوں کی محکمیت پر دل سے یقین نہیں رکھتے۔ جنہیں ان پر یقین ہے انہیں ہر حال اسی یقین پر زندہ رہنا۔ اسی کی پکار کو بلند کئے جانا اور یہی کچھ کرتے ہوئے یہاں سے آگے چلے جانا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ہم اگر اسلام کے نصب العین پر یقین نہیں رکھتے تو کفر کے معیاروں کے مطابق زندگی ڈھال لیں۔

قرآنی نظام

اب آگے بڑھو۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ ہم یہاں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔ یہی وہ دعوے تھا جس کی بنا پر ہم متحدہ ہندوستان کے تصور کو یہ کہہ کر رد کیا کرتے تھے کہ اس قسم کی مخلوط حکومت میں ہم اپنے دینی تصور کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لیکن جب پاکستان مل گیا تو ہم نے اپنے اس دعوے سے گریز کی راہیں نکالنی شروع کر دیں۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ

(۱) ہم میں ایک طبقہ ایسا ہے (خواہ اس کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو) جو اسلام کی طرف سے قطعاً مایوس ہے اور اس کے قوانین و اقدار کو عہدِ پارینہ کی داستان سمجھتا ہے۔

(۲) دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو حقیقی اسلام سے تو مایوس نہیں لیکن اسلام کے نام پر جو کچھ ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ اس کے سخت خلاف ہے۔

لیکن حالت یہ ہے کہ نہ اول الذکر طبقہ میں یہ جرأت ہے کہ وہ اسلام سے اپنی مایوسی کا علانیہ اظہار کر کے اکوئی اور روش اختیار کر لیں۔ اور نہ ثانی الذکر کو یہ بیباکی عطا ہوئی ہے کہ وہ قدامت پسند طبقہ کے خلاف جو کچھ اپنی خلوتوں میں کہتے ہیں وہ کچھ جلوتوں میں بھی کہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ قدامت پرست طبقہ (یا اُن کے زیرِ اثر عوام) میں پاپولر ہونے کے لئے ان تمام رسومات کو ادا کرتے اور ان تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جن کے وہ دل سے خلاف ہیں اور جن کا وہ اپنی پرائیویٹ محفلوں میں مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی جرأت سے کام نہیں لے سکتے وہ بڑی بڑی مہمات میں بیباکی اور بلند حوصلگی سے کس طرح کام لے سکتے ہیں۔ منافقت کی زندگی جرأتوں کو مفقود اور حوصلوں کو پست کر دیتی ہے۔ اور یہ وہ مرض ہے جو اس وقت ہمارے معاشرے میں عام ہو رہا ہے۔

قرآن پر ایمان

ان سے آگے بڑھو تو ہمارا مذہب پرست طبقہ آتا ہے۔ ان کے متعلق میں تمھیں پچھلے خط میں بتا چکا ہوں کہ ایک طرف یہ قرآن کے متعلق یہ بھی اعلان کرتے رہتے ہیں کہ یہ دنیا کی بے مثل و بے نظیر کتاب ہے جس میں زندگی کے تمام معاملات کا بہترین اور مکمل حل دیا گیا ہے اور دوسری طرف ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ یہ کتاب (معاذ اللہ) تضادات سے بھری ہوئی ہے۔ نامکمل ہے۔ مبہم ہے۔ غیر واضح ہے۔ غیر مربوط ہے۔ ناقابل فہم ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنی آسمانی کتاب کے متعلق اس قسم کے متضاد عقائد کی حامل ہو وہ زندگی کے دیگر معاملات میں کس طرح یکسو ہو سکتی ہے؟

اب تم ان بلند طبقات سے نیچے اتر کر، عام لوگوں کی طرف آؤ اور دیکھو کہ وہ کس بری طرح بے یقینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مستقل اقدار سے بے یقینی

تم نے اگلے دنوں چوہدری حاکم علی کی باتیں سنی تھیں۔ یہ شخص بڑا دیانتدار آدمی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت جب یہ لاہور آیا ہے تو اس کا حلقہ اثر اتنا وسیع تھا کہ یہ اگر چاہتا تو کئی کوٹھیاں الاٹ کرا لیتا اور لاکھوں کا مال سمیٹ لیتا۔ لیکن اس نے ایک تنکا بھی اپنے لئے نہیں لیا۔ یہ بڑی حوصلہ مندی اور ہمت کا کام تھا۔

لیکن تم نے دیکھا کہ وہ اب کیا کہہ رہا تھا! اسے رہ رہ کر افسوس آ رہا تھا کہ اس نے اس وقت ایسی "حماقت" کیوں کی اور کیوں نہ دوسروں کی طرح لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیا۔ یعنی دیانتدار ہونے کے باوجود اسے اس بات پر یقین نہیں رہا کہ دیانتداری واقعی اچھا اصول ہے اور نہ اسے اس پر فخر ہے کہ اس نے ایسے وقت میں دیانتداری سے کام لیا جب بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل رہے تھے۔ اسے دیانتداری کی حکمت پر یقین نہیں رہا۔ اسے اپنی روش کی صداقت پر یقین نہیں رہا۔ وہ اگرچہ اب عملاً کسی لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اب اس کا موقع ہی نہیں رہا لیکن اسے اس پر یقین نہیں رہا کہ لوٹ کھسوٹ برا کام ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ لہذا وہ دیانتدار ہونے کے باوجود بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا قلب اس صحیح اطمینان سے محروم ہو چکا ہے جو اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو کسی کام کو زندگی کا اصول اور فریضہ سمجھ کر کرے اور اس کے بدلے خواہ کتنے ہی نقصانات کیوں نہ ہوں اسے کبھی اس پر افسوس نہ آئے کہ میں نے اصول پرستی سے کیوں کام لیا!

یاد رکھو سلیم! چوہدری حاکم علی ایک فرد نہیں بلکہ وہ پاکستان کے ایک ایسے عظیم طبقہ کا ترجمان ہے جس نے تقسیم کے وقت بڑی دیانتداری سے کام لیا تھا، لیکن جو اب اپنے اس فیصلہ اور عمل پر متاسف ہے اور اس طرح زندگی کی بلند اقدار سے

اس کا یقین اُٹھ چکا ہے۔

رشوت دہی

تم حاجی روشن دین کو جانتے ہو۔ پانچ چھ سال ہوئے اس نے بساط خانے کا مختصر سا کاروبار شروع کیا تھا اور تہیہ کیا تھا کہ وہ حلال کی روزی میں حرام کا چھینٹا نہیں پڑنے دے گا۔ اس کے متعدد اصولوں میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ کسی کو رشوت نہیں دے گا۔ پچھلے سال جب وہ حج کے لئے چلا ہے تو کاروباری سلسلہ میں اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ایک سخت غلطی کی تھی جس کا خمیازہ میری طرح بھگتنا۔ تم میرے تجربہ سے فائدہ اٹھانا اور ایسی غلطی نہ کرنا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ میں نے تہیہ کیا تھا کہ کسی کو رشوت نہیں دوں گا۔ میں اپنے اس فیصلے پر قائم تو رہا لیکن اس کی وجہ سے جس قدر پریشانیاں اٹھائیں اور نقصانات برداشت کئے، ان کے پیش نظر میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے بڑی حماقت کی۔ تم نے وہی کچھ کرنا جو باقی دنیا کرتی ہے۔ بڑے آرام سے رہوگے اور نقصان سے بچوگے۔ دس روپے رشوت دیدینے سے سو روپے کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور انسان بک بک جھک جھک سے الگ چھوٹتا ہے۔ میں تو جب تک ہو سکے گا اپنی بات کو نبھاؤں گا لیکن تم ایسی غلطی نہ کرنا۔

دیکھا تم نے سلیم! کہ ہم میں سے جو شخص اس اصول پر قائم ہے کہ وہ رشوت نہیں دے گا وہ بھی دل سے اپنے اصول کی صداقت کا قائل نہیں وہ دیانتداری میں بھی بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا سینہ ہر وقت کشمکش بیہم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے، اصول پرستی تسکے لئے "سانپ کے منہ میں چھپکلی" کی طرح ہو چکی ہے کہ "اگلے تو لاج آئے۔ نگلے تو کوڑھی بنے"۔

بے یقینی ہی بے یقینی

میں نے تمہیں دو چار مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا معاشرہ کس طرح بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ان مثالوں پر غور کرنے کے بعد تم اپنے گردوپیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ کتنے ہیں جن کے قلب و زبان میں ہم آہنگی اور عقیدہ و کردار میں یک رنگی ہے۔ کتنے ہیں جو زبان پر وہ کچھ نہیں لاتے جو دل میں محسوس کرتے ہیں تاکہ عوام میں (un-popular) نہ ہو جائیں۔ کتنے ہیں جو غلط باتوں سے اجتناب کرتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ وہ باتیں اصولاً غلط ہیں بلکہ اس لئے کہ اس سے مقبولیت بڑھتی ہے۔ کتنے ہیں جو بددیانتی سے بچتے ہیں لیکن دل میں اس پر متاسف ہوتے ہیں۔ کتنے ہیں جو ہر قسم کا نقصان برداشت کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مطمئن ہیں کہ ہم نے اصول پرستی کی خاطر یہ نقصانات برداشت کئے ہیں اور ایسے نقصانات برداشت کرتے رہیں گے لیکن اصولوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ سوچو سلیم! کہ ہمارے معاشرہ میں کتنے ہیں جو زندگی کی مستقل اقدار پر اس قسم کا یقین رکھتے ہیں؛ ظاہر ہے کہ جو معاشرہ اس طرح بے یقینی کے جذام میں مبتلا ہو جائے اس سے کسی صحت مندانہ اقدام کی توقع عبث ہے۔ اس سے کوئی تعمیری کام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے

جس ملت کے افراد کی یہ حالت ہو کہ انہیں کسی اصولِ زندگی پر یقین نہ ضابطۂ حیات پر ایمان۔ وہ زبان سے جس روش پر عقیدہ ظاہر کرتے

ہوں دل سے اس کی صداقت کے قائل نہ ہوں۔ وہ کہتے کچھ ہوں اور چاہتے کچھ۔ سوچو کہ ایسے افراد کے ہاتھوں ملت کی بہبود کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ جس معاشرے میں نہ لیڈر اپنی سیاست پر یقین رکھتا ہو نہ مولوی اپنی شریعت پر ایمان۔ نہ "دیانتدار" اپنی دیانت کی صداقت کو دل سے مانتا ہو نہ "اصول پرست" اپنے اصولوں کی سچائی پر مطمئن۔ نہ کام کرنے والا افسر یہ کہہ کر سکھ کی نیند سوئے کہ میں نے اپنے فرائض کو پوری دیانتداری سے سرانجام دیدیا۔ نہ ایماندار کاروباری اس پر خوش کہ اس نے نقصان اٹھا لیا لیکن دیانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس معاشرے سے یہ امید رکھنا کہ وہ مفادِ خویش سے آگے بڑھ کر اجتماعی مفاد کی خاطر یہ طیب خاطر قربانیوں کے لئے تیار ہو جائے گا، خود فریبی کے سوا اور کیا ہے؟ جس معاشرے میں ہر "نیکوکار" کو اپنی نیکوکاری پر افسوس آرہا ہو اور ہر "دیانتدار" اپنی دیانتداری پر متاسف، اس سے ان حسنات کی توقع رکھنا جن کا سرچشمہ دل کا یقین اور قلب کا اطمینان ہوتا ہے، اپنے لئے سامانِ حسرت خریدنا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ میں تو میں زندگی سے محروم اور سرفرازیوں سے بے گانہ رہ جاتی ہیں۔ نہ ان کے کشتِ امل پر سحابِ کرم کی گہرباری ہوتی ہے نہ ان کے کاشانوں پر رحمتوں کا نزول قرآن نے رحمتوں کے نزول کے لئے ایک ہی طریقہ بتایا تھا اور وہ یہ کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰)۔ جن لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ اور پھر اپنے اس عقیدہ پر استقامت سے جم کر کھڑے ہو گئے۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف و حزن نہ کرو اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یعنی وہی قوم خوف و حزن سے محفوظ اور زندگی کی خوش حالیوں اور سرفرازیوں سے شادکام ہوتی ہے جس کے افراد اپنے عقیدہ پر جم کر کھڑے ہو جائیں۔ جنہیں اس کی صداقت پر یقینِ محکم ہو۔ ان کا یقین سکون و طمانیت کی ہزار جنتیں ان کے سینوں میں آباد کر دیتا ہے اور اس کے زندہ و تابندہ نتائج زندگی کی فردوس بداماں خوشگواریوں کی شکل میں ہر آن سامنے آتے رہتے ہیں۔

یہ ہے سلیم! ہمارا اصلی مرض اور یہ ہے اس مرض کا صحیح علاج۔ یعنی اپنے نظریاتِ حیات پر محکم یقین۔ اور اپنے تصوراتِ زندگی پر غیر متزلزل ایمان۔ جب قوم کے افراد کے دل میں اپنے تصورات و نظریات کے متعلق اس قسم کا کوہ آسا یقین پیدا ہو جائے تو پھر دیکھو کہ ان کا یہی ساز و سامان کس قسم کے کہکشاں گیر نتائج پیدا کرتا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس قسم کے یقین کے بغیر نہ ہم ایک قوم بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری کوششیں کوئی نتیجہ مرتب کر سکتی ہیں۔ قوموں کے شجرِ حیات کی اصل (جڑ) ان کا یقین ہے۔ ایسا یقین جس میں کسی قسم کا ریب و تشکیک اور تذبذب و تزلزل نہ ہو۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، ہمارا کوئی عمل بارآور نہیں ہو سکتا۔

اب تم یہ پوچھو گے کہ موجودہ حالات میں، افرادِ قوم کے دل میں اس قسم کا یقین پیدا کیسے کیا جائے؟ تفصیل اس اجمال کی بھی طویل ہے لیکن ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ یقین پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم سے۔ اور ہمارے ہاں یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

کہنے والے نے غلط نہیں کہا تھا کہ

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

خود قرآن نے بھی داعیٔ انقلاب کا بنیادی فریضہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ بتایا ہے، لہٰذا اگر ہم نے مسلمان قوم کی حیثیت سے جینا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن کی تعلیم کو عام کر دیں۔

لیکن قرآن کی تعلیم سے مراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مذہبی مدارس میں "دینی علوم" کے ضمن میں دی جاتی ہے اور جو طالبار کو قرآن سے بیگانہ ہی نہیں بنا دیتی، بلکہ اس پر ان کا ایمان بھی ختم کر دیتی ہے۔ قرآن کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ متعلم، علیٰ وجہ البصیرت یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ بلاشک و شبہ یہ کتاب عظیم نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی مشکلات کا صحیح حل اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس کا دل اس پر گواہی دے کہ اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے سے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں اور کامرانیاں نصیب ہوتی ہیں اور اس کے خلاف جانے سے فرد (اور قوم) کی انسانی زندگی کی اسی طرح موت واقع ہو جاتی ہے جس طرح سنکھیا کھانے سے اس کی طبعی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے یقین کے بغیر ان تباہیوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جن میں ہمارا معاشرہ گھر چکا ہے۔

والسلام

پرویز

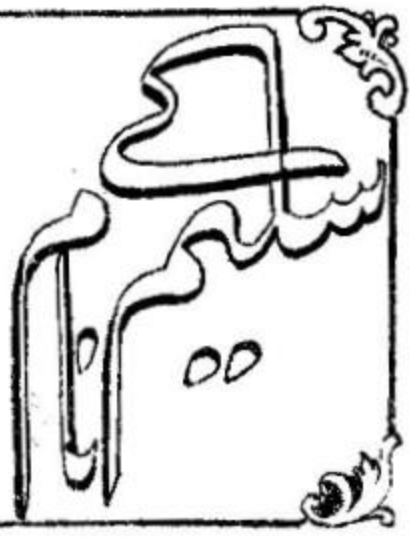

مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور مدلل جواب بڑے سائز کے ۸۰ صفحات

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:-

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

25/B گل برگ کالونی۔ لاہور

مجلس اقبال

مثنوی رموز بیخودی

در معنیٔ ایں کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است

سابقہ عنوان میں علامہ اقبال نے بتایا ہے کہ قرآن کریم ہی وہ سنگِ بنیاد۔ وہ نقطۂ ماسکہ۔ وہ محور و مرکز اور وہ وجۂ جامعیت ہے جس کی رُو سے مسلمان ایک اُمت بن سکتے ہیں۔ ان کا موجودہ تشتت و انتشار اور پستی و ذلت نتیجہ ہے ان کی اس شوریدہ بختی کا کہ انھوں نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اس پستی سے نکلنے کا واحد طریق یہ ہے کہ وہ پھر سے قرآن کو اپنی زندگی کا راہ نما اور نصب العین بنالیں۔ قرآن کو زندگی کا راہ نما بنانے سے مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی کے تمام مسائل کا حل قرآن سے دریافت کریں اور اس کی روشنی میں اپنی مملکت کے آئین و قوانین مرتب کریں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے اجتہاد ناگزیر ہے۔ یعنی اپنے مسائل کا جائزہ لیکر قرآن کریم میں غور و فکر کرنا اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں قوانین مرتب کرنا۔

لیکن زیر نظر عنوان میں علامہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ انحطاط (زوال) کے زمانہ میں اجتہاد سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ تقلید کا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔ تقلید سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے، امت اسی پر کاربند رہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا خیال تک بھی دل میں نہ لائے۔

قرآن (اور اقبال کے عمومی فکر و پیغام) کا طالب علم یقیناً اقبال کی اس رائے (اور مشورہ) کو حیرت سے دیکھے گا اور اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئے گا کہ انھوں نے ایسی بات کس طرح کہہ دی جو نہ صرف قرآن کی تعلیم ہی کے خلاف ہے بلکہ قوموں کے

عروج وزوال کے فلسفہ کی بھی نقیض ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اقبالؒ حامل وحی نہیں تھے کہ انہیں کسی مسئلہ میں غلطی نہ لگتی۔ انہوں نے یہ کچھ اپنی فکر کے ابتدائی ایام میں کہا تھا۔ لیکن جب (بعد میں) ان کی فکر میں پختگی اور مطالعہ میں مزید وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی تو انہوں نے خود ہی اس رائے کو بدل لیا۔ چنانچہ جب انہوں نے (سنہ ۱۹۲۸ء میں) اپنے مشہور (چھ) لیکچرز لکھے ہیں تو ان میں اس غلطی کی تصحیح کر دی۔ وہ چھٹے لیکچر میں اجتہاد کے متعلق تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

جب بغداد کی تباہی نے ملت کا شیرازہ بکھیر دیا تو قدامت پرست مفکرین نے قوم کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اپنی تمام توجہات کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو محفوظ رکھ لیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے فتویٰ دیدیا کہ فقہائے سلف نے جو قوانین شریعت مرتب کر دیئے ہیں ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات کے پیش نظر صرف ملت کا معاشرتی نظم تھا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس اہم حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اسے ہمارے دور کے علماء سمجھتے ہیں۔ کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس میں جماعتی نظم پر زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے معاشرتی فکر کے سرمایہ کا تو مالک بن جاتا ہے لیکن اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا ...... زوال آور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم میں بخود رخزیدہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں وہ ایسے معیار زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوڑا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

(خطبات اقبال - چھٹا خطبہ)

یہ اقتباس کسی تبصرہ وضاحت یا تشریح کا محتاج نہیں۔ اس میں علامہ اقبال نے خود ہی اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ دورِ انحطاط میں اجتہاد کی کہیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ زوال کے زمانے میں تقلید، اس زوال پر مہر تقدیس ثبت کر دیتی ہے اور اس کے بعد اس سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ زوال سے نکلنے کا طریق یہ ہے کہ ذہنی اور فکری جمود کو توڑا جائے۔ زندگی کے حقائق کا مردانہ وار سامنا کیا جائے۔ اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے قرآن کی روشنی میں سابقہ قوانین میں ضروری تبدیلی کی جائے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ لہٰذا انحطاط کے زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔

بنا بریں علامہ اقبال نے جو کچھ اپنی مثنوی کے زیر نظر باب میں لکھا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے بعد میں خود ہی اس کی تردید کر دی تھی، اس لئے ہمیں اس کی تردید میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس باب کو پیش اس لئے کر رہے ہیں کہ کتاب کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ علامہ اقبال کو چاہیئے یہ تھا کہ بعد میں اس حصہ کو خود ہی کتاب سے خارج کر دیتے۔ اس باب کی کتاب میں موجودگی سے نقصان یہ ہے کہ قدامت پرست طبقہ تقلید جامد کی تائید میں بہت سے اسے پیش کر دیتا ہے اور اس طرح فکر و پیغام اقبال کا مقصد، خود اقبال کے حوالہ سے فوت ہو جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ علامہ اقبال ہوں یا کوئی اور۔ دین میں سند اور حجت کسی انسان کا قول نہیں۔ سند اور حجت صرف خدا کا کلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (حضرت علامہ کی اس قدر عقیدت کے باوجود) ہمیں ان کے کلام میں جہاں کوئی بات قرآن کے خلاف محسوس ہوتی ہے، اس کی کھلے الفاظ میں تردید کر دیتے ہیں۔ اور یہی روش ہر اس شخص کی ہونی چاہیئے جو حق و باطل کا معیار قرآن کو قرار دیتا ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

* * *

اس تمہیدی صراحت کے بعد، مثنوی کا زیر نظر باب ملاحظہ کیجیئے۔ کہتے ہیں۔

عہد حاضر فتنہ ہا زیر سر است
طبع ناپروائے او آفت گر است

ہمارے زمانے میں ہزاروں نئے نئے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ اس سے معاشرہ پر نت نئی آفت آتی ہے۔

بزم اقوام کہن بر ہم ازد
شاخسارِ زندگی بے نم ازد

قدیم اقوام کی بساط الٹ رہی ہے۔ ان کی تہذیب و تمدن کی داستانیں اساطیر الاولیں قرار دی جا رہی ہیں۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو رہی ہے۔

جلوہ اش مارا زما بیگانہ کرد
ساز ما را از نوا بیگانہ کرد

اس نے ہمیں ایک ایسی جھلک دکھائی ہے جس سے ہم اپنے آپ سے بیگانہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے ساز تو باقی ہیں لیکن ان میں نوا کوئی نہیں۔

از دلِ ما آتشِ دیرینہ بُرد
نورِ و نارِ لا الٰہ از سینہ بُرد

اس نے ہمارے دلوں سے عشق کی آگ بجھا دی۔ لا الٰہ کا سوز و ساز ہمارے سینوں سے گم ہو گیا۔

منحل گردد چو تقویم حیات
ملت از تقلید می گیرد ثبات

جب کسی قوم پر انحطاط چھا جائے۔ جب اس میں زندگی اور اس کی توانائیاں باقی نہ رہیں تو اس وقت قوم کے ثبات و استحکام کا راز اسی میں ہے کہ وہ اسلاف کے مسلک و مشرب پر آنکھیں بند کر کے چلی جائے۔

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است
معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

اُس وقت ملت کی شیرازہ بندی صرف تقلید سے قائم رہ سکتی ہے۔ اس لئے اسلاف کے طریق پر آنکھیں بند کر کے چلے جانے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔

در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار
از شجر مگسل بامید بہار

اس میں شبہ نہیں کہ خزاں کے موسم میں سارا درخت خشک ہو جاتا ہے۔ اس میں زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اس وقت کوئی شاخ (یہ سمجھ کر کہ اب اس درخت کے ساتھ لگے رہنے سے کیا حاصل ہے) اس سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے تو بعد میں جب بہار کا موسم آئے گا تو درخت کی تمام شاخیں پھر گل پیرہن ہو جائیں گی لیکن اس شاخِ بریدہ کے حصہ میں زندگی کی کوئی نئی نہیں آئے گی۔

اس مثال کو علامہ اقبال نے کئی ایک اور مقامات پر بھی پیش کیا ہے۔ ہم نے جیسا کہ شروع میں کہا ہے، ہم اس عنوان کو علی حالہٖ بیان کر دینا چاہتے ہیں، اس پر تنقید نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے اس مقام پر بھی اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ملت سے کٹ کر الگ ہو جانا اور بات ہے۔ اور پوری ملت کا آنکھیں بند کر کے اس روشِ کہن پر چلتے چلے جانا جس کی وجہ سے اس پر زوال آیا ہے، اور بات۔ ملت سے کٹ جانا یقیناً بُری بات ہے۔ لیکن اس کے اندر رہتے ہوئے اُس راستے کے بدلنے کی کوشش نہ کرنا جو اسے اس قعرِ مذلت تک لے آیا ہے، کسی نہج سے بھی عملِ مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بحر گم کردی زیاں اندیش باش — حافظِ جوئے کم آبِ خویش باش
شاید از سیلِ تہستاں بر خوری — باز در آغوشِ طوفاں پروری

تم نے سمندر کو گم کر دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اب بھی اپنے نفع اور نقصان کا اندازہ کرنا چاہیئے۔ سمندر گم کرنے کے بعد یہ جو چھوٹی سی ندی باقی رہ گئی ہے اس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت پہاڑوں سے سیلاب اٹھے اور اس ندی کو پھر سے آغوشِ بحر میں لے جائے۔

یہاں پھر وہی مغالطہ ہے۔ ندی کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے راستے کو نہ بدلا جائے

جس کی وجہ سے وہ سمندر سے الگ ہو گئی ہے۔

پیکرت دارد اگر جانِ بصیر   عبرت از احوالِ اسرائیل گیر

گرم و سرد روزگارِ او نگر   سختیِ جانِ نزار او نگر

اگر تمھارے جسم میں شعور و احساس باقی ہے تو تم یہودیوں کی تاریخ پر غور کرو اور ان کے انجام و مآل سے عبرت پکڑو۔ تم دیکھو کہ وہ کس طرح ذلیل درسوا، زمانے کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور کہیں پناہ نہیں پاتے۔

خوں گراں سیر است در رگہائے او

سنگ صد دیلیز در یک ہپائے او

ان کا خونِ حیات ان کی رگوں میں جم گیا ہے۔ ان میں نہ زندگی باقی رہی ہے نہ حرارت۔ ان کی رسوائیوں کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیا کی ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں

پنجۂ گردوں چو انگورش فشرد   یادگارِ موسیٰ و ہاروں نمرد

از نوائے آتشینش رفت سوز   لیکن اندر سینہ دم دارد ہنوز

زانکہ چوں جمعیتش از ہم شکست   جز براہِ رفتگاں محمل نہ بست

ان کے پیکرِ حیات سے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ گیا۔ لیکن انھوں نے حضرت موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کی یاد کو دل سے محو نہ ہونے دیا۔ وہ صحرا بصحرا اور دشت بدشت آوارہ و بے چارہ پھرتے رہے لیکن اپنے اسلاف کے راستے کو نہ چھوڑا۔ اس سے ان کی قومی وحدت باقی رہی۔

یہاں پھر وہی مغالطہ ہے۔ یہودیوں کی جمیعت ان کی نسل پرستی کی وجہ سے قائم رہی۔ ورنہ جہاں تک آباء کے راستے پر چلنے کا تعلق ہے، قرآن نے ان کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اس میں اس روش کو سرِ فہرست رکھا ہے وہ بار بار کہتا ہے کہ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (۳۱/۲۱)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں؛ ہم اسی روش پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے۔ تقلید، قرآن کی رُو سے بدترین جرم ہے۔ اسی سے قومیں جہنم کی تباہیوں میں جا گرتی ہیں۔ مسلمانوں سے جو کچھ کہنا چاہیئے (اور جسے ذرا آگے چل کر خود علامہ اقبال نے واضح کر دیا ہے) وہ یہ ہے کہ اپنے زوال و انحطاط سے اس نتیجہ پر نہ پہنچ جانا کہ یہ زوال اسلام سے متمسک رہنے کا نتیجہ ہے۔ اگر دین کو چھوڑ کر باقی دنیا کی طرح زندگی بسر کی جائے تو ہم بھی ترقی کر جائیں گے۔ ہمارا انحطاط، اسلام سے متمسک رہنے کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام کو چھوڑ کر انسانوں کا خود ساختہ مذہب اختیار کر لینے کا نتیجہ ہے اور یہ وہ روش ہے جسے ہمارے آباء صدیوں سے اختیار کئے چلے آتے ہیں۔ ہمارے سے کرنے کا کام یہ ہے کہ اس خود ساختہ مذہب کو چھوڑ کر اُس دین کی طرف آجائیں جو ہمیں اللہ کی طرف سے ملا تھا اور

جس پر چل کر محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے چند دنوں میں ایسی ترقی کرلی تھی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بنی اسرائیل کی شال پیش کرنے کے بعد علامہ اقبال مسلمان سے کہتے ہیں۔

اے پریشاں محفلِ دیرینہ ات   مرد شمعِ زندگی در سینہ ات
نقش بر دل معنئ توحید کن   چارۂ کارِ خود از تقلید کن

مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تمھاری محفل دیرینہ بھی پریشان ہو چکی ہے۔ تمھاری وحدت گم اور مرکزیت فنا ہو چکی ہے۔ تمھارے سینوں میں شمع زندگی فروزاں نہیں رہی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم پھر سے اپنے دل پر "توحید" کا نقش ثبت کرلو۔ اور تقلید سے اپنے امراض کا علاج ڈھونڈھ لو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں۔ ہماری تمام بیماریوں کا علاج "توحید" میں مضمر ہے۔ یعنی صرف اللہ کے قانون (قرآن) کی اطاعت۔ نہ کہ تقلید آباء۔۔۔

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

انحطاط کے زمانے میں اجتہاد، قوم کی بساط اُلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس دلیل کی تردید خود علامہ اقبال اپنے خطبہ میں کرچکے ہیں (جس کا اقتباس شروع میں دیا جاچکا ہے)

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے آبار کی تقلید کہیں بہتر ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اجتہاد کے لئے علم و نظر اور فکر و بصیرت اولین شرط ہے۔ لیکن اجتہاد کے لئے اہلیت کی شرط عائد کرنا اور بات ہے اور اجتہاد کا دروازہ بند کرکے تقلید کو نجات کی راہ سمجھ لینا اور بات۔

عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست   کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرشاں ریسد ہمے باریک تر   ورعِ شاں با مصطفےؐ نزدیک تر

یہ وہی دلائل ہیں جو ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے تقلید کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ اسلاف کا علم و عقل کیسا تھا۔ اور ان کا زہد و تقویٰ کیسا۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جو نئے تقاضے پیدا ہوئے ہیں، انھیں اس کا تو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کا اجتہاد اور تدبر اپنے زمانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا ہمیشہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ کے لئے صرف خدا کی کتاب کافی ہو سکتی ہے۔ جس کی روشنی میں ہر دور کا مسلمان اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تدبر اور تفکر کا حکم کسی خاص زمانے کے مسلمانوں کو نہیں دیا۔ ہر دور کے مسلمانوں کو دیا ہے۔

جیساکہ ہم نے شروع میں کہا ہے علامہ اقبال نے یہ مثنوی اپنی فکر کے ابتدائی ایام (۱۹۱۲ء کے قریب) لکھی تھی۔ اس کے بعد جب ان کی فکر میں مزید پختگی آگئی اور قرآن پر مزید عبور حاصل ہوگیا تو انھوں نے خود ہی ان خیالات کی تردید کردی۔ تقلید آبار کے متعلق وہ پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں کہ

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے | زبندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب | پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

بہرحال ہم نے چونکہ مثنوی کے پورے باب کو سامنے لانا ہے اس لئے اگلے اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں۔

ذوقِ جعفرؒ کاوشِ رازیؒ نہ ماند
آبروئے ملّتِ تازی نہ ماند

گلہ یہ ہے کہ قوم میں ذوقِ جعفرؒ اور کاوشِ رازیؒ باقی نہیں رہی۔ دلیکن سوال یہ ہے کہ جب قوم سے یہ کہہ دیا کہ تمہارے لئے سوچنا حرام ہے تو پھر ذوقِ جعفرؒ اور کاوشِ رازیؒ رہے گی کس طرح سے ؟)

تنگ بر ما رہ گذارِ دیں شد است
ہر لئیمے رازدارِ دیں شد است

ہم پر دین کا راستہ تنگ ہوگیا ہے۔ اس لئے کہ — ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔

اے کہ از اسرارِ دیں بیگانۂ
با یک آئیں ساز اگر فرزانۂ

تو دین کے اسرار و رموز سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اگر تجھ میں ذرا بھی عقل باقی ہے تو کرنے کا کام یہ ہے کہ ساری ملت کے لئے ایک قانون کا اتباع لازمی قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ

من شنیدستم زنبّاضِ حیات
اختلافِ تست مقراضِ حیات

میں نے ان لوگوں سے جن کی انگلیاں نبضِ زمانہ پر ہیں، سنا ہے کہ باہمی اختلاف رشتۂ حیات کے لئے قینچی کا حکم رکھتا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو خود یہی دلیل تقلید کی عمارت کو بنیاد سے گرا دیتی ہے۔ آج مسلمان فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور فرقوں کے جواز میں اس کے سوا اور کوئی دلیل نہیں کہ ہمارے آبار کے راستے ہیں۔ لہذا جب تک قوم "آباء کے راستوں" کو اپنے لئے دلیل راہ بنائے رکھے گی، ان میں کبھی وحدت نہیں پیدا ہو سکے گی۔ وحدت کا طریق ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ طریق آبار کو چھوڑ کر ملت قرآن کی طرف آجائے۔ یہی وہ تدبیر ہے جس پر علامہ اقبال نے اگلے اشعار میں زور دیا ہے۔ یعنی

از یک آئینے مسلماں زندہ است | پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

پیکرِ ملت کی زندگی کا راز قرآن میں مضمر ہے اسے تقلید کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آنا ہوگا۔ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ۔

ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

ہمارے پیکروں میں دھڑکنے والا دل، قرآن ہے۔ اسی سے ہم زندہ ہو سکتے اور آگے چل سکتے ہیں۔ یہی حبل اللہ ہے جس سے تمسک ہم میں وحدت پیدا کر سکتا ہے۔

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

افرادِ ملت کے بکھرے ہوئے دانے، ایک تسبیح میں قرآن کے رشتے سے پروئے جا سکتے ہیں۔ لہذا اگر تم نے اپنے اندر وحدت پیدا کرنی ہے تو اس "حبل اللہ" کے رشتے میں منسلک ہو جاؤ۔ ورنہ غبارِ سرِ راہے کی طرح پریشان۔ فلہذا ذلیل و خوار رہو۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ علامہ اقبال شروع میں تقلیدِ آبا پر زور دیتے رہے ہیں لیکن آخر میں اعتصام بحبل اللہ (یعنی مختلف راستوں کو چھوڑ کر) قرآن سے وابستگی کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک سوچنے والا انسان یقیناً متعجب ہوگا کہ اقبال جیسا مفکر، ایک ہی مقام پر اس قسم کی متضاد باتیں کس طرح کہہ گیا؟ بات ہے تعجب کی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جو کچھ علامہ کہنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ تم اپنے زوال سے گھبرا کر یورپ کی مادہ پرستی کا راستہ اختیار نہ کر لینا۔ ملت کے ساتھ وابستہ رہنا۔ اور قرآن کی طرف رجعت کی کوشش کرنا۔

لیکن یہ کچھ کہنے کے لئے انہوں نے جو انداز اختیار کیا اس سے سخت مغالطہ پیدا ہو جانے کا احتمال (ہی نہیں بلکہ یقین) ہے۔ اسی لئے ہم نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی ہے۔

اقبال اور قرآن

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:-

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام 25/8 گل برگ کالونی لاہور

مغربی سرمایہ دارانہ نظام پر اسلامی ٹھپہ

(چوہدری محمد اسماعیل صاحب راولپنڈی)

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تحریرات کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ متضاد باتیں کہتے ہیں تاکہ جس قسم کی ضرورت پیش آئے۔ اس قسم کی بات آگے بڑھا دی جائے۔ جو شخص مذہب کو اپنی مفاد پرستیوں کا آلہ کار بنالے وہ ایسی ہی روش اختیار کرے گا۔ چوہدری محمد اسماعیل صاحب نے مودودی صاحب کے معاشی نظریہ کا اس نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے نتائج کو عام فہم الفاظ میں سیدھے سادے طریق سے پیش کر دیا ہے۔ اسے ہم عام قارئین کے استفادہ کے لئے بہ سلسلہ اصلاح و تبلیغ شائع کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

تمہید معاشیات کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ بیشتر جھگڑوں اور بیماریوں کا باعث معاشی سوال ہی ہے۔ اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میرے دل میں جستجو پیدا ہوئی کہ علم المعیشت کا مطالعہ کیا جائے مگر چونکہ ہم اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن حکیم کو اصولی طور پر مکمل ضابطہ حیات سمجھتے ہیں اس لئے میں چاہتا تھا کہ تمدن و معاشیات سے متعلق صحیح اسلامی اصول و نظریات معلوم کروں۔ اس سلسلہ میں جب کبھی کسی رسالہ یا اخبار میں کوئی مضمون میری نگاہ سے گزرتا تو میں اس کا مطالعہ کر لیتا۔ اور کبھی اِدھر اُدھر اپنے حلقہ احباب میں اس مسئلہ سے متعلق گفت و شنید ہو جاتی۔ آخر میرے ایک دوست نے مجھے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی معاشیات سے متعلق تصنیف کردہ کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے مولانا کی کتابیں سود اور مسئلہ ملکیت زمین وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

مولانا کی کتاب سود کی تمہید میں جب میں نے پہلے صفحہ پر یہ فقرہ پڑھا کہ "اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں اور ہمارے گرد و پیش کی دنیا

پر ایک ایسا نظام پوری طرح حاوی ہوگیا ہے جس کی بنیاد سرمایہ داری کے اصولوں پر رکھی گئی ہے" تو مجھے اطمینان ہوا اور خیال آیا کہ جب مولانا نے یہ حقیقت واضح کردی ہے۔ کہ ہمارے گرد و پیش سرمایہ دارانہ نظام معیشت حاوی ہے تو وہ ضرور اس سے مختلف اسلامی نظم معیشت پیش کریں گے۔ چند فقرے آگے پڑھنے کے بعد جب میں نے یہ فقرہ پڑھا کہ "اسلام کا نظم معیشت اپنے نظریہ اور اصول میں سرمایہ داری نظم معیشت سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں دونوں کی طرح جدا جدا ہے۔ اور دونوں کے مناہج علیحدہ علیحدہ ہیں" تو میں سمجھا کہ مجھے گوہر مقصود مل گیا۔

لیکن ہر دو حصہ "سود" اور مسئلہ ملکیت زمین بغور پڑھنے کے بعد مجھے نہایت مایوسی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ مولانا الٹ پھیر کر کیا اصولی اور کیا عملی طور پر مروجہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام پر ہی اسلام کا ٹھپہ لگا کر پیش کرتے ہیں اہل مغرب دنیاوی طریق پر سرمایہ دارانہ نظام کو چلاتے ہیں اور جہاں کہیں وہ دقت محسوس کرتے ہیں اس کی اصلاح کے لئے آئین و قوانین میں رد و بدل کر لیتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب بھی اگر غیر مسلموں کی طرح دنیاوی طور پر اس نظام کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تو کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اس سرمایہ دارانہ نظام پر اسلام کی مہر تصدیق ثبت کر کے اس پھندے کو ہمارے گلے میں ڈالتے ہیں تاکہ مسلمان تا قیامت اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا سود حصہ اول میں قرآن کریم کی آیات کے حوالوں سے اسلامی نظم معیشت کے ارکان پیش کرتے ہیں اور سود کو جو کہ سرمایہ داری کی جان ہے۔ قرآن و حدیث کی رو سے قطعی ناجائز اور حرام قرار دیتے ہیں اور یہاں تک لکھتے ہیں کہ "اسلام جس نقشے پر انسان کی اخلاقی تربیت تمدنی شیرازہ بندی اور معاشی تنظیم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ہر ہر جز سے سود کلی متافات رکھتا ہے۔ اور سودی کاروبار کی ادنےٰ سے ادنےٰ اور بظاہر معصوم سے معصوم صورت بھی اس پورے نقشے کو خراب کر دیتی ہے"

اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہ مولانا سود کو اسلامی نظم معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں مابہ الامتیاز قرار دیتے ہیں۔ اور سود کی جگہ زکوٰۃ کو قائم کرتے ہیں یہاں تک تو بات صاف ہے۔ اور ہم بھی مولانا کے ساتھ متفق ہیں۔ لیکن سود اس قسم کا بہروپیا واقع ہوا ہے کہ وہ کاروباری دنیا میں سو روپ دھار کر سامنے آتا ہے۔ اور مولانا اسے اسلامی جواز کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اس طرح معاشیات سے متعلق مولانا کے کلام میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ان کے بیان کردہ اسلامی نظم معیشت کے ارکان کالعدم ہو جاتے ہیں اور ان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

میں نے اس بارے میں مولانا مودودی صاحب کو چٹھی لکھی کہ آپ کی تحریر میں یہ تضاد ہے۔ لیکن انہوں نے مختصر سا جواب دینے کے بعد اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے سے انکار کر دیا[1]۔ لہٰذا میں بحیثیت متلاشی حق یہ مضمون مفکرین اسلام

[1] یہ خط و کتابت الگ شائع کر دی گئی ہے۔ (مؤلف)

کی خدمت میں پیش کر کے استدعا کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر غور فرمائیں تاکہ ہمارے ملک میں وہ معاشرہ قائم ہو سکے جس میں صحیح اسلامی روح کام کرتی ہوئی دکھائی دے اور ہم اسلام کی ہدایات اور احکام پر چل کر دینی و دنیوی ترقیات حاصل کر سکیں۔

اس جگہ ضمناً ایک اور بات کا اظہار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتب میں تین نظامہائے معاشیات سرمایہ داری۔ اسلام اور اشتراکیت کا تذکرہ کیا ہے۔

ہمارا واسطہ اس وقت دو نظاموں سے ہے۔ اوّل اسلام۔ کیونکہ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اور ہم اس کو صحیح دین سمجھتے ہیں دوسرے سرمایہ دارانہ نظام جو ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر حاوی ہے اشتراکیت سے چونکہ ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے لہٰذا میں اس کو نظر انداز کر کے صرف اسلام اور سرمایہ داری سے متعلق ہی مولانا کے نقطۂ نگاہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں اور اس مضمون کو ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تین ابواب میں تقسیم کروں گا:۔

باب اوّل:۔ اس بیان میں کہ مولانا سود کو ایک طرح حرام قرار دے کر سرمایہ داری کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرح جائز قرار دے کر سرمایہ داری کو قائم کرتے ہیں۔

باب دوم۔ مولانا کے پیش کردہ اسلامی نظم معیشت اور جائز کردہ سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں تضاد۔

باب سوم۔ اسلامی نظم معیشت سے متعلق اپنے خیال کا اظہار۔

باب اوّل

اس بیان میں کہ مولانا مودودی صاحب سود کو ایک طرح سے حرام قرار دے کر سرمایہ داری کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرح جائز قرار دے کر سرمایہ داری کو قائم کرتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب قرآن و حدیث کی رو سے سود کی حرمت بیان کر کے سود حصّہ اوّل صفحہ ۳۹ پر لکھتے ہیں۔

"ان تمام احکام کا منشا یہ نہ تھا کہ محض سود کی ایک خاص قسم یعنی یوژری (مہاجنی سود) کو بند کیا جائے اور اس کے سوا تمام اقسام کے سودوں کا دروازہ کھلا رہے۔ بلکہ ان سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ تمدن اور سرمایہ دارانہ نظم معیشت کا کلی استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی ہو۔ خود غرضی کی بجائے ہمدردی اور امادِ باہمی ہو سود کی بجائے زکوٰۃ ہو۔ بنکنگ کی جگہ قومی بیت المال ہو"

زمینداری میں بٹائی

اب دیکھئے کہ مولانا کس طرح مختلف ناموں کے ماتحت سود کو حلال قرار دے کر سرمایہ دارانہ نظام معیشت پر اسلام کی مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ

"جو شخص خود کاشت نہ کرے یا نہ کر سکتا ہو یا خود کاشتی کی حد سے زائد زمین رکھتا ہو۔ اس کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اپنی زمین دوسرے لوگوں کو زراعت کے لئے دے اور پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف جس پر بھی فریقین میں معاہدہ ہو اپنا حصہ مقرر کر لے جس طرح تجارت اور صنعت اور دوسرے کاروباری معاملات میں مضاربت جائز ہے بالکل اسی طرح زراعت میں مزارعت بھی جائز ہے"

اوّل تو واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں بھی زمینداری کا یہی دستور ہے، جیسا مولانا نے تحریر کیا ہے۔ پھر غور کا مقام ہے۔ کہ بٹائی کیا چیز ہے۔ آیا اس میں سود کی کیفیت اور خواص پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ سود کے زمرہ میں شمار ہوتی ہے یا نہیں۔ ہم اپنی طرف سے کوئی دلیل دئے بغیر بٹائی کو سود کی اس تعریف پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں جو کہ مولانا نے سود حصہ اوّل صفحہ ۳۶ پر کی ہے۔ وہو ہذا۔

"ربوا یہ ہے کہ ایک شخص اپنا راس المال / اپنی زمین ایک دوسرے شخص کو دیتا ہے کہ میں اتنی مدت میں اتنی رقم / اتنی پیداوار تجھ سے راس المال / زمین پر زائد لوں گا۔ اس معاملہ میں راس المال / زمین کے مقابل راس المال / زمین ہے۔ اور مہلت کے مقابلہ میں وہ زائد رقم / پیداوار جس کی تعیین پہلے بطور ایک شرط معاملہ کے کر لی جاتی ہے۔ اسی زائد رقم / پیداوار کا نام ربوا ہے جو کسی خاص مال یا شے کا معاوضہ نہیں بلکہ محض مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے"

مولانا کی پیش کردہ مندرجہ بالا سود کی تعریف کو دیکھئے اور اس پر بٹائی کے انطباق کو ملاحظہ کیجئے۔ پھر سود اور بٹائی کی کیفیت و ماہیت اور خواص پر غور فرمائیے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ آیا ان میں کوئی فرق ہے؟

مرہونہ زمین سے بٹائی اور سود

سود حصہ دوم صفحہ ۱۴۱ پر مولانا لکھتے ہیں "چونکہ اس نظام میں (یعنی جو نظام مولانا قائم کرنا چاہتے ہیں) قرض لینے والے سے کسی نوعیت کا فائدہ اٹھانا قرض دینے والے کے لئے جائز نہ ہوگا۔ جو شخص کوئی زمین یا مکان یا اور کسی قسم کی جائیداد رہن رکھے گا اس کی آمدنی سود میں کھپنے کی بجائے اصل میں وضع ہوگی"

یعنی مولانا کے نزدیک کسی کو روپیہ قرض دے کر جو بھی جائداد رہن لی جائے اس کی آمدنی مرتہن کے لئے سود ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرہونہ زمین سے حاصل کردہ بٹائی میں، اگر مولانا کو سود کی کیفیت اور خواص نظر آتے ہیں تو مملوکہ زمین سے حاصل کردہ بٹائی میں سود کی کیفیت اور خواص کیوں نظر نہیں آتے؟

واضح ہے کہ جہاں تک مزارع کا تعلق ہے اس کی حیثیت مملوکہ اور مرہونہ زمین میں بالکل یکساں ہے۔ اس کو تو اپنی محنت سے پیدا کردہ دولت میں سے بہرصورت حصہ ادا کرنا پڑتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کے نزدیک اگر مزارع کی کھال مالک اتارے تو جائز اور اگر مرتہن اتارے تو ناجائز۔ مرتہن بھی تو زر خرچ کر کے جائداد کا قبضہ حاصل کرتا ہے۔

دُنیا جب صدر دروازہ بند دیکھتی ہے تو چور دروازہ کی تلاش کرتی ہے۔ لیکن جب صدر دروازہ ہی کھلا ہو تو کسی کو چور دروازہ کی تلاش کیوں ہوگی۔ یعنی اگر مولانا کے اسلامی نظام میں مرہونہ جائداد سے فائدہ اٹھانا ممنوع ہوگا تو کسی کو کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ روپیہ قرض دے کر کوئی جائداد رہن لے اور اپنا فائدہ گنوائے۔ وہ کیوں نہ جائداد رہن لینے کی بجائے خرید کر بیٹائی خوری اور کرایہ خوری کرے پھر مرہونہ جائداد سے نفع خوری کو ممنوع قرار دینے کا کیا فائدہ اور کیا مقصد؟

کرایہ اور سود

مولانا مودودی صاحب مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۹۷ پر لکھتے ہیں۔

"رہا نقد لگان تو اگر وہ کرایہ زمین کی نوعیت رکھتا ہے تو جائز ہے لیکن اگر پیداوار کا تخمینہ کر کے مالک زمین اس میں اپنا حصہ پیشگی ایک مخصوص رقم کی شکل میں وصول یا معین کرلے تو اصولاً اس میں اور سود خوری میں کوئی فرق نہیں۔ کرایہ میں لحاظ صرف اس امر کا ہونا چاہیئے کہ مالک اپنی چیز کو کرایہ دار کے لئے مہیا کرتے اور مہیا رکھنے کا اور اس نقصان کا جو کرایہ دار کے استعمال سے اس کی چیز کو پہنچتا ہے معاوضہ طلب کرے۔ وہ چیز خواہ مکان ہو یا فرنیچر یا سواری یا زمین بہرحال اس پہلو سے اس کا معاوضہ یقیناً لیا جا سکتا ہے۔ اور زیادہ نقصان دہ یا کم نقصان دہ استعمال کے لحاظ سے اس معاوضہ میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر چیز کا مالک معاوضہ کا تعین اس لحاظ سے کرے کہ کرایہ دار میری چیز کو جس معاشی کاروبار میں استعمال کر رہا ہے۔ اس میں اندازاً اس کو اتنا نفع ہوگا لہٰذا اس میں سے مجھے اتنا معاوضہ لازماً ملنا چاہیئے تو یہ پورا معاوضہ قطعی سود ہو جائے گا۔"

مندرجہ بالا تحریر میں مولانا ایک لحاظ سے مقرر کردہ کرایہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے مقرر کردہ کرایہ کو سود قرار دیتے ہیں۔ بالعموم کرایہ کی کمی بیشی کا انحصار اشیائے مطلوبہ کی رسد اور مانگ پر ہوتا ہے جن جگہوں میں زمین مکانات و دوکانات یا دیگر اشیاء کی کرایہ پر مانگ زیادہ ہوتی ہے وہاں کرائے بڑھ جاتے ہیں۔ اور جہاں مانگ نہیں ہوتی کرائے کم ہوتے ہیں لہٰذا ایک لحاظ سے یا دوسرے لحاظ سے کرایہ مقرر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اگر بموجب تحریر مولانا کرایہ کے تعین میں لحاظ کو خاص دخل ہے۔ اور واقعی ایک لحاظ سے کرایہ معین کرنا کرایہ کی پوری رقم کو سود بنا دیتا ہے اور دوسرے لحاظ سے کرایہ کا تعین اس کو جائز کر دیتا ہے تو مالک کو جواز والے لحاظ سے کرایہ مقرر کر کے مذہبی گرفت سے بچنے میں کیا انکار یا دقت ہو سکتی ہے۔ وہ کیوں نہ کرایہ کو حلال و طیب بنا دینے والے لحاظ سے کرایہ معین کرے گا۔ کیونکہ اس طرح وہ مالی فائدہ بھی ویسا ہی اٹھا سکتا ہے۔ اور مذہبی گرفت سے بھی بچ سکتا ہے۔ اور اگر غیر معمولی حالات میں حکومت کرایہ پر پابندی لگا دے تو پھر کسی خاص لحاظ سے کرایہ کے تعین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ کرایہ بھی حکومت مقرر کرے گی وہی قبول کرنا ہوگا۔

پس مولانا کے ایک لحاظ سے کرایہ کے تعین و وصولی کو سود حرام قرار دینے اور دوسرے لحاظ سے جائز قرار دینے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سرمایہ داری کے محل میں داخل ہونے کے لئے ایک راستہ کو ممنوع قرار دے کر دوسرا متوازی

راستہ کھول دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مالک کرایہ کا تعین خواہ کسی لحاظ سے بھی کرے اس کی کیفیت و ماہیت اور خواص میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ کرایہ کی رقم تو اس نے بہرصورت کرایہ دار کی کمائی میں سے ہی وصول کرنی ہے۔ لہٰذا اگر کرایہ کی رقم ایک لحاظ سے وصول کرنا سود ہے تو لازماً دوسرے لحاظ سے وصول کرنا بھی سود ہی رہے گا۔

کرایہ کشی سسٹم

دراصل لوگ اپنی ذاتی ضرورت سے زائد زمین یا مکان و دوکان وغیرہ اسی لئے حاصل کرتے ہیں کہ انہیں نادار وں کو کرایہ پر دے کر نفع اٹھایا جائے۔ اگر کرایہ کی رقم محض اس شے کے اخراجات مرمت وغیرہ تک ہی محدود ہو اور اس سے غیر مکتسب کمائی کا حصول مقصود نہ ہو تو کوئی شخص کیوں اپنی ذاتی ضرورت سے زائد زمین یا دوکان و دوکانات وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس صورت میں کرایہ کشی سسٹم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کرایہ کشی سسٹم ہی دراصل بالواسطہ سود خواری کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔ اگر کرایہ کشی سسٹم سے بالواسطہ سود خواری کا مقصد نہ ہوتا تو یقیناً لوگ بموجب ارشاد الٰہی العفو (جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہے دے دو) پر عمل کرتے۔

کرایہ کی رقم میں سے اخراجات مرمت و انتظام وغیرہ منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچتا ہے۔ اس کو لازماً سرمایہ کا معاوضہ یعنی سود ہی شمار کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ تمام معاشیین کرتے ہیں۔ کرایہ کی اس رقم پر مولانا کی پیش کردہ مندرجہ بالا سود کی تعریف چسپاں کر کے دیکھئے کس طرح صحیح بیٹھتی ہے۔ پھر بھی اگر مولانا اس رقم کو سود تسلیم نہ کریں تو مہربانی کر کے بتائیں کہ اگر یہ رقم سود نہیں تو اور کیا ہے؟

صنعت و تجارت میں منافع

اب ہم مولانا کی سود سے متعلق تحریرات کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ تجارت و صنعت میں منافع کی کیا حقیقت ہے۔ مولانا رسائل و مسائل صفحہ ۹۷، ۳۹۶ پر لکھتے ہیں کہ اگر کوئی دوکاندار نقد خریدنے والے گاہک سے اشیاء کی کم قیمت لے اور اُدھار لینے والے سے زیادہ تو یہ زیادتی صریحاً سود ہے۔

ادھار لینے والے گاہک سے نقد والے گاہک کی بہ نسبت زیادہ قیمت لینے میں تو مولانا کو سود دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی ادھار والی قیمت نقد والے گاہک سے وصول کرلے تو اس میں ان کو سود دکھائی نہیں دیتا اس زیادتی کو مولانا نفع کے نام سے موسوم کر کے جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ادھار دینے والا تو مہلت دیتا ہے اور نقد والا اصل مع سود یکمشت پہلے ہی دھرا لیتا ہے۔ ادھار اور نقد قیمتوں کا فرق اگر سود ہے تو اس نقد قیمت میں جو کہ ادھار والی قیمت کے برابر ہے۔ زیادتی کو لازماً سود تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ سود کوئی موہوم چیز نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے۔

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی مکان میں داخلہ ممنوع قرار دینا منظور ہو تو روشندانوں کو نظر انداز کرکے اس کے دروازے بند کئے جاتے ہیں لیکن مولانا عام حالات میں نفع خواری کے دروازے کھلے رکھ کر روشندان بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھلا جب عام حالات میں نفع پر کوئی پابندی نہیں تو نقد اور ادھار قیمتوں میں تفاوت پر پابندی کے کیا معنے؟ اگر ادھار اور نقد قیمتوں کے تفاوت کو قانوناً منع بھی قرار دیا جائے تو ممکن ہے کہ ادھار نہ مل سکے لیکن منافع خواروں کی منافع خواری میں تو کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اسی لئے غیر معمولی حالات میں حکومتیں نرخ کنٹرول تو کرتی ہیں لیکن نقد اور ادھار قیمتوں کے فرق پر کوئی پابندی عاید نہیں کرتیں۔ کیونکہ ایسی پابندی کا کوئی مقصد نہیں۔

ہم جنس اشیاء کا تبادلہ اور سُود

سود حصہ اوّل صفحہ ۳۴ پر مولانا لکھتے ہیں:-

"ربوا الفضل اُس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے"

مثل ہے پانی کی حفاظت کرو روپیہ اپنی حفاظت خود کرے گا۔ جس کا مطلب واضح ہے کہ جو شخص پانی کی حفاظت کرنے کا خیال رکھے گا وہ روپیہ کی حفاظت تو خود ہی کرے گا۔ چنانچہ رسول کریم کے ارشادات کا مطلب و منشا بھی واضح ہے کہ کہ نقد لین دین یا متبادلہ اشیاء میں کوئی شخص اپنے حق المحنت سے تجاوز کرکے زیادہ ستانی نہ کرے۔ نہ یہ کہ ہم جنس اشیاء میں تو زیادہ ستانی نہ ہو لیکن غیر جنس اشیاء کے تبادلہ یا نقد لین دین میں حسب معمول سوایا ڈیوڑھا دگنا جتنا بھی کوئی شخص منافع اٹھا سکے جائز ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ کے ارشاد کے مطابق اگر ہم جنس اشیاء کے لین دین میں زیادہ ستانی سود ہے تو لازماً غیر جنس اشیاء کے تبادلہ یا نقد لین دین میں بھی زیادہ ستانی یعنی اپنے حق المحنت سے تجاوز کو سود ہی قرار دینا پڑیگا

نفع کیا ہے

عرف عام میں کسی شئے کی قیمت خرید کو اس کی قیمت فروخت میں سے منہا کرکے جو رقم باقی بچ جائے اس کو نفع شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ منافع درحقیقت مفرد چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں مختلف عناصر ہوتے ہیں۔ سود کا عنصر بھی اسی منافع کی آڑ میں پناہ لیتا ہے۔ ان مختلف عناصر کو علیحدہ کرنے سے سود کا عنصر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

فرض کیجئے ایک آدمی اکیلا یا چند آدمی مل کر کچھ سرمایہ سے کوئی تجارتی یا صنعتی کاروبار کرتے ہیں۔ وہ اپنی تنخواہیں یا کارکردگی کی اُجرت جو ان کو کسی دوسری جگہ سے مل سکتی ہے مقرر کر لیتے ہیں سال کے بعد تمام قسم کے اخراجات کاروبار (مزدوروں کی اُجرت کارخانہ یا دکان کا کرایہ بجلی یا پنکھے کے بل اوزارات اور مشینوں کی گھسائی اور مالکان کاروبار کی اپنی مقررہ تنخواہیں سرمایہ محفوظ بیمہ کے اخراجات وغیرہ سب کچھ نکال کر فرض کیجئے ان کو اصل زر پر دس فی صدی منافع ہوتا ہے۔ اصل زر

پر یہ دس فیصدی اضافہ کیا ہے؟ یہ کس چیز کا معاوضہ ہے؟ جتنا جی چاہے سوچ لیجئے اور غور کر لیجئے سوائے اس کے کہ اس رقم کو اصل کا معاوضہ یعنی سود شمار کیا جائے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس رقم کو اصطلاحی طور پر منافع کہ لیجئے یا "مائدۃ من السماء" کہہ کر پکارئے اس کی حقیقت اور فطری خاصیت میں بال برابر بھی تغیر واقع نہ ہوگا۔

علم المعیشت میں تو معلوم نہیں منافع اور سود سے متعلق دریافت کب ہوئی لیکن قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ منادی کر کے حقیقت واضح کر دی تھی کہ فلکم رؤس اموالکم۔ یعنی تم اپنے اصل زر کے حقدار ہو اس پر جو بڑھوتری بھی تم لوگے وہ سود شمار ہوگا۔

ادھر تو مولانا مودودی صاحب سود حصہ اوّل صفحہ ۵۱ پر حضرت عمرؓ کا قول پیش کرتے ہیں کہ "اس چیز کو بھی چھوڑ دو جو یقیناً سود ہے۔ اس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو" لیکن اِدھر وہ اس چیز کو سود ماننے کے لئے تیار نہیں جس کو دنیا کے معاشیین سود قرار دیتے ہیں اور اس کو نفع کا نام دیکر حلال و طیب بناتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب اربوں روپے کے کاروبار میں منافع کے مقدس نام کے ماتحت مختلف اشیاء کے تبادلہ یا نقد خرید و فروخت میں زیادہ ستانیاں روا ہوں تو نقد اور ادھار کی قیمتوں میں تفاوت اور ہم جنس چیزوں کے تبادلہ میں زیادہ ستانی کو ناروا قرار دینا بے معنی اور بے مقصد ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح مولانا برائے نام متوازی راستوں کو بند قرار دیتے ہیں اور سرمایہ داری کی شاہراہوں پر از روئے اسلام چلنے کی کھلی چھٹی دے کر سرمایہ دارانہ نظم معیشت کو مذہبًا قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

واضح ہے کہ مولانا زمینداری تجارت اور صنعت و حرفت میں اصولاً وہی طرز و طریق وہی بٹائی خواری اور وہی منافع خواری جائز قرار دیتے ہیں جو کہ ہمارے گرد و پیش سرمایہ دارانہ نظام معاشیات میں مروج ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سود سے نجات حاصل کر سکیں جس کو وہ اس نظام میں تجارتی لین دین کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ وہ سود حصہ اوّل صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں۔

"سرمایہ داری کے نقطہ نظر سے سود اور تجارتی لین دین کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ اس لئے نظام سرمایہ داری میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف خلط ملط ہو جاتے ہیں بلکہ کاروبار کی ساخت میں ان کی حیثیت تانے بانے کی سی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تجارت کے لئے سود اور سود کے لئے تجارت لازم و ملزوم ہیں۔"

بنکنگ میں سود اب ملاحظہ کیجئے کہ مولانا کس طرح سرمایہ دارانہ بنکنگ میں سود خواری کے صدر دروازے پر اسلام کا سائن بورڈ آویزاں کر کے اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ بنکنگ کی اسلامی صورت کے زیر عنوان سود حصہ دوم صفحہ ۱۴۹ پر لکھتے ہیں کہ "جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ انسداد سود کے بعد بنکوں میں سرمایہ اکٹھا ہونا ہی بند ہو جائے گا وہ غلطی پر ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جب سود ملنے کی توقع ہی نہ ہوگی تو لوگ کیوں اپنی فاضل آمدنیاں بنک میں

رکھوائیں گے حالانکہ اس وقت سود کی نہ سہی نفع ملنے کی توقع تو ضرور ہوگی اور چونکہ نفع کا امکان غیر معین اور غیر محدود ہوگا اس لئے عام شرح سود کی بہ نسبت کم نفع حاصل ہونے کا جس قدر امکان ہوگا اسی قدر اچھا خاصا زیادہ نفع ملنے کا امکان بھی ہوگا..... وہ سرمایہ جو لمبی مدت کے لئے بنکوں میں رکھا جائے گا تو اسے وہ سودی قرض پر چلانے کی بجائے اپنے کھاتہ داروں کی اجازت سے بڑی اچھی طرح مضاربت کے اصول پر تجارتی کاروبار میں صنعتی سکیموں میں زراعتی کاموں میں اور پبلک اداروں اور حکومتوں کے نفع آور کاموں میں لگا سکیں گے۔ پھر جو منافع ان ذرائع سے بنکوں کو حاصل ہوں گے ان کو وہ اپنے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد ایک مقررہ تناسب کے مطابق اپنے حصہ داروں اور کھاتہ داروں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس معاملہ میں فرق صرف یہ ہوگا کہ بحالت موجودہ منافع (حصہ داروں میں تقسیم ہوتے ہیں اور کھاتہ داروں کو سود دے دیا جاتا ہے اس وقت دونوں میں منافع ہی تقسیم ہوں گے۔ اب کھاتہ داروں کو ایک متعین شرح کے مطابق سود ملا کرتا ہے اس وقت شرح کا تعین نہ ہوگا بلکہ جتنے بھی منافع ہوں گے خواہ کم ہوں یا زیادہ وہ سب ایک تناسب کے ساتھ تقسیم ہو جائیں گے۔

مولانا مودودی صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کے لحاظ سے موجودہ بنکوں اور مجوزہ اسلامی بنکوں میں فراہمی سرمایہ کی صورت تو یکساں ہے۔ سرمایہ کو آگے لگانے کی صورت بھی یکساں ہی ہے۔ یعنی موجودہ بنک بھی حکومت اور پبلک اداروں کو تجارتی صنعتی اور زراعتی کاموں کے لئے سرمایہ دیتے ہیں اور اسلامی بنک بھی ایسے ہی اپنا سرمایہ آگے چلائیں گے۔ دونوں قسم کے بنکوں میں فرق یہ ہوگا کہ موجودہ بنک تو مقررہ شرح سود پر روپیہ لیتے دیتے ہیں لیکن مجوزہ اسلامی بنک مضاربت یعنی منافع پر روپیہ کا لین دین کریں گے جس کی شرح منافع حاصل ہونے پر مقرر ہوگی۔

مضاربت کی حقیقت

مولانا مودودی صاحب موجودہ بنکوں کے سود کو حرام قرار دے کر اس کی سخت مذمت کرتے ہیں لیکن مجوزہ اسلامی بنکوں کے اس طریق کار کو مضاربت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اس طریق پر حاصل شدہ نفع کو حلال اور طیب قرار دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مضاربت کے طریق پر حاصل شدہ نفع کی حقیقت کیا ہے۔ آیا سود ہی نفع کا بہروپ دھار کر ہمیں دھوکا دیتا ہے یا واقعی یہ نفع سود سے کوئی مختلف چیز ہے۔

فرض کیجئے ایک دنیا دار آدمی دوسرے آدمی کو ۲۰۰ روپے قرض دیتا ہے اور اس سے ۵/- روپے ماہوار سود لے لیتا ہے۔ یہ ۵/- روپے مولانا کے نزدیک سود اور حرام ہیں لیکن ایک خدا پرست آدمی ایک بے روزگار نادار کو کہتا ہے کہ سود کھانا چونکہ حرام ہے اس لئے میں سود نہیں لوں گا البتہ سرمایہ میں دوں گا اور محنت تمہاری ہوگی اور اس طرح جو نفع نقصان ہوگا وہ نصف نصف کر لیں گے۔ اس طرح مضاربت کے اصول پر خدا پرست سرمایہ دار نادار کو ۲۰۰/- روپے دے دیتا ہے۔ نادار ۲۰۰/- روپے سے کام شروع کر دیتا ہے اور اوسط ۳۰/- روپے ماہوار کما لیتا ہے جس میں سے ۱۵/- روپے ماہوار خدا پرست کو مل جاتے ہیں۔ دنیا دار کے وہ ۱۵/- روپے سود حرام! اور خدا پرست کے یہ ۱۵/- روپے حلال و طیب! بس یہی طریق کار مولانا کے مجوزہ اسلامی بنکوں کا ہوگا۔ وہ بگلہ بھگت سود خواری نہیں کریں گے بلکہ اچھی طرح مضاربت کے اصول پر نفع نقصان میں

شریک ہوں گے اور جیسا کہ مولانا لکھتے ہیں "چونکہ نفع کا امکان غیر معین اور غیر محدود ہوگا۔ اس لئے عام شرح سود کی بہ نسبت ان کو کم نفع حاصل ہونے کا جس قدر امکان ہوگا اسی قدر اچھا خاصا زیادہ نفع ملنے کا امکان بھی ہوگا۔"

سود اور نفع کا منبع

معمولی تدبر سے پتہ چلتا ہے کہ سود اور نفع کی پیدا آوری کا منبع ایک ہی جگہ ہے جو لوگ سود کی پیدا آوری کے عامل ہیں وہی لوگ نفع کی پیدا آوری کے عامل ہیں۔ وہ منبع کہاں ہے؟ مولانا کے قلم سے یہ حقیقت سود حصہ اول صفحہ ۶۵ پر یوں آشکارا ہوتی ہے۔ " حقیقت میں سود غریبوں کی جیب ہی سے آتا ہے۔ حکومت کا خزانہ ہو یا بنک یا انشورنس کمپنی سب کا اصل منبع غریب کی جیب ہی ہے" پس سود در حقیقت اصل زر پر وہ اضافہ ہے جو پہلے مرحلہ پر کاروباری لوگوں کے ہاتھ میں نفع کہلاتا ہے لیکن دوسرے مرحلہ پر بنک میں پہنچ کر سود کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

پھر جس طرح موجودہ بنکوں میں لوگ اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا محنت و مشقت دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتے ہیں، اسی طرح اسلامی بنکوں کی صورت میں بن جائیں گے۔ جس طرح سرمایہ موجودہ بنکوں میں کام کرتا ہے۔ اسی طرح اسلامی بنکوں میں کام کرے گا۔

جس طرح موجودہ بنکوں میں سود سرمایہ دار کی غیر مکتسب کمائی ہوتی ہے عین اسی طرح نفع سرمایہ دار کی غیر مکتسب کمائی ہوگی۔ گویا نفع سود اور سود نفع ہے۔ یعنی ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ دریں صورت موجودہ سرمایہ دارانہ بنکوں اور مجوزہ اسلامی بنکوں میں کوئی جوہری فرق دکھائی نہیں دیتا۔

نفع سود کو شکست نہیں دے سکتا

مولانا مودودی صاحب کے خدا پرست سرمایہ دار تو سود خواری کی بجائے نفع خواری کو ہم خرما و ہم ثواب سمجھ کر ضرور ترجیح دیں گے لیکن دوسرے کاروباری ادارے اِن لوگوں کو نفع میں شریک کرنے کی بجائے مقررہ شرح کے مطابق سود ادا کرنا بہتر خیال کریں گے۔ وہ مضاربت کے اصولوں پر سرمایہ داروں کو اپنے کاروبار میں شریک کرکے سود کی بہ نسبت زیادہ نفع ادا کرنا ہرگز پسند نہیں کر سکتے۔ لہٰذا نفع خواری سود خواری کو شکست دے کر اس کی جگہ لینے کا فخر حاصل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ در حقیقت دونوں میں ایک ہی روح کام کرتی ہے۔ اور وہ ہے غیر مکتسب کمائی کا حصول۔ بنکنگ کی اسلامی صورت کے زیر عنوان کتاب کے اختتام پر مولانا لکھتے ہیں "غیر سودی مالیات کا یہ مجمل نقشہ جو ہم نے پیش کیا ہے کیا اسے دیکھنے کے بعد بھی اس شبہ کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سود کا انسداد قابلِ عمل نہیں ہے"

مولانا تو ضرور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے غیر سودی مالیات کا فارمولا دریافت کرکے اسلامی بنکنگ کی تجویز مرتب کر دی ہے لیکن اس میں سوائے اس کے کوئی حقیقت نظر نہیں آتی کہ انہوں نے سود حاصل ہونے سے پہلے سود کی شرح معین کرنے کی بجائے سود حاصل ہونے کے بعد اس کی شرح مقرر کرنا قرار دے کر اس کو نفع کے نام سے موسوم کرکے اسلامی جامہ پہنا دیا ہے

گویا مولانا اِدھر شعبہ ہائے زراعت تجارت اور صنعت و حرفت میں سرمایہ داری کے صدر دروازوں کو کھلا رکھ کر دریچوں کو بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُدھر شعبہ بنکنگ میں باب سرمایہ داری سے سود کا سائن بورڈ اُتار کر نفع کا سائن بورڈ آویزاں کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مولانا مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو ہی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی پر ہم کو چلانا چاہتے ہیں لیکن یہ کام وہ دنیا داری کے طریق پر جیسا کہ سرمایہ دار دنیا کر رہی ہے نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کو اسلام کے مقدس نام کے ماتحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ کوئی شخص سرمایہ داری کے جوئے سے تاقیامت گردن نہ نکال سکے۔

نتیجہ اگر زراعت میں بٹائی خواری اور تجارت و صنعت میں منافع خوری اور بنکنگ کی سود خواری کو اسی طرح جائز تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ مولانا تحریر فرماتے ہیں تو لازماً اس کا نتیجہ وہی مغربی سرمایہ داری اور وہی سرمایہ دارانہ نظام ہوگا جو کہ ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر حاوی ہے کیونکہ بٹائی خواری کی ذہنیت تقاضا کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کرنے کی کوشش کرو تمہیں خود محنت نہ کرنی پڑے اور تم کسانوں کی محنت کے ثمرہ کا معتد بہ حصہ دار بن سکو۔ زیادہ ستانی اور منافع خواری کی ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرو تاکہ تم بلا محنت و مشقت دوسروں کی کمائی میں شریک ہو کر عیش و آرام حاصل کر سکو۔ اصطلاحی سود تو اس کے ساتھ لازم ہے۔ اگر بٹائی کرایہ اور منافع وغیرہ کے ناموں کے تحت سود خواریاں جائز رہیں گی تو اصطلاحی سود لازماً قائم اور رائج رہے گا۔ کیونکہ ان میں اور اس میں درحقیقت ایک ہی روح کام کرتی ہے

مولانا مودودی صاحب اُدھر قرآن مجید سے اسلامی نظم معیشت پیش کرتے ہیں اور اُدھر معمول الٹ پھیر کے ساتھ مغربی سرمایہ دارانہ نظام پر اسلام کا ٹھپہ لگاتے ہیں لہٰذا ان دونوں تعلیمات کا متضاد ہونا لازمی بات ہے۔ اگلے باب میں اس تضاد کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

باب دوم

مولانا کے قرآن مجید سے پیش کردہ اسلامی نظم معیشت اور جائز کردہ سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں تضاد

۱۔ سود حصہ اوّل صفحہ ۱۹ پر اسلامی نظم معیشت کے زیر عنوان مولانا قرآن حکیم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ ترجمہ "اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو بجز اس کے کہ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو۔ اور تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے اور جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کرے ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم آگ میں جھونک دیں گے (۴/۲۹) اور اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ "اس آیت میں لین دین کے لئے جواز کی دو شرطیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہو دوسرے یہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہ ہو ..... مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے فائدے کے لئے دوسرے کا نقصان کرتا ہے وہ گویا اس کا خون پیتا ہے۔"

واضح ہے کہ اس آیہ کریمہ کی رو سے لین دین میں اپنے حق المحنت سے تجاوز کر کے اپنے فائدے کے لئے دوسرے سے زیادہ ستانی یعنی منافع خواری کو ظلم قرار دیا گیا ہے لیکن برخلاف اس کے مولانا اپنی کتاب سود میں کئی جگہ اصولی طور پر منافع خواری کو جائز قرار دیتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ "بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے بہرحال وہ صرف ایک ہی مرتبہ لیتا ہے" "منافع پر کوئی پابندی نہیں۔" "پوری آزادی ہے اپنے مال کی جو قیمت چاہیں رکھیں۔"

۲۔ اسلامی نظم معیشت کے تحت مولانا صفحہ ۲۰ پر قرآن کریم سے ایک اور آیت پیش کرتے ہیں

ترجمہ۔ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی خبر دے دو (۹/۳۴) اور اس کے نیچے لکھتے ہیں بچت کو جمع کرنا اور جمع شدہ دولت کو مزید دولت پیدا کرنے میں لگانا یہی دراصل سرمایہ داری کی جڑ ہے مگر اسلام سرے سے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی اپنی ضرورت سے زائد دولت جمع کر کے رکھے۔ برخلاف اس کے سود حصہ دوم صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں کہ "مالیات میں اسلام افراد کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ ان کی آمدنیوں کا جو حصہ ان کی ضروریات سے بچ رہے۔ اسے جمع کریں یا دوسروں کو قرض دیں یا خود کسی کاروبار میں لگائیں یا کسی صنعت و حرفت میں اپنا سرمایہ دے کر اس کے نفع و نقصان میں حصہ دار بن جائیں۔"

۳۔ اسی طرح اسلامی نظم معیشت کے باب میں سود حصہ اول صفحہ ۲۰ پر قرآن مجید سے آیت پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ۔ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہو کہ جو ضرورت سے بچ رہے (البقرہ ۲/۲۱۹) اور اس کے متعلق لکھتے ہیں "جمع کرنے کی بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے مگر خرچ کرنے سے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے۔ یعنی آپ کے پاس اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ جائے اس کو جماعت کی بھلائی کے کاموں میں خرچ کر دیں یہی سبیل اللہ ہے" لیکن اس کے برعکس مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۸۳، ۸۲ اور سود حصہ دوم صفحہ ۷۰ پر لکھتے ہیں کہ اسلام کسی نوع کی ملکیت پر مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگاتا۔ کپڑے برتن فرنیچر مکانات موٹر کار کشتی جانور روپیہ پیسہ آلات مشین زمین وغیرہ غرض کہ ہر چیز بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ یعنی ہر چیز کا ضرورت سے زیادہ رکھنا جائز ہے

۴۔ پھر اسلامی نظم معیشت کے ارکان کے ماتحت قرآن مجید سے ایک اور آیت پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے (۵۱/۱۹) اس کے بالکل الٹ سود اور مسئلہ ملکیت زمین میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بٹائی خواری اور کرایہ خواری جائز ہے یعنی زمینداروں اور سرمایہ داروں کا نادار کی محنت کی کمائی میں حق ہے۔

۵۔ اسلامی نظم معیشت کے ارکان کے باب میں ہی صفحہ ۲۴ پر ایک اور آیت پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ تم نے جو کچھ کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے۔ اس میں سے عمدہ مال کو راہ خدا میں صرف کرو (۲/۲۶۷) یعنی اپنی مکتسب کمائی میں سے دو۔ لیکن ادھر عین اس کے برخلاف مولانا اپنی کتابوں میں بٹائی کرلیا اور عام لین دین میں زیادہ ستانی (منافع خواری) یعنی غیر مکتسب کمائی کھانا جائز قرار دیتے ہیں۔

۶۔ ادھر اسلامی نظم معیشت کے ارکان کے ماتحت مولانا زکوٰۃ کا حکم سناتے ہیں اور ادھر برخلاف اس کے اسلامی بنکوں میں اپنا ضرورت سے زائد روپیہ دے کر محنت و مشقت دوسروں کی محنت کی کمائی میں سے حصہ بٹانے کا جواز قائم کرتے ہیں اور سود کی بجائے اس کا پاکیزہ نام نفع رکھتے ہیں غرضیکہ مولانا کی اسلامی نظم معیشت کے ارکان کے زیر عنوان قرآن مجید سے پیش کردہ تعلیم اور جائز کردہ سرمایہ دارانہ تعلیم میں خوفناک تضاد ہے۔

جس کتاب کی یہ تعلیم ہو کہ دولت جمع نہ کرو بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور جو کتاب ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دے وہ کیونکر اجازت دے سکتی ہے۔ کہ کوئی شخص دولت جمع کر کے ہزارہا ایکڑ اراضی خرید کر اپنی دولت کو اراضی کی شکل میں محفوظ کرلے اور مختلف نوع کا بے شمار عیش و عشرت کا سامان اور روپیہ رکھے کیونکہ ایسی اجازت سے تو مذکورہ بالا حکم بے معنی اور کالعدم ہو جاتا ہے۔ پھر جو کتاب یہ حکم دے کہ سرمایہ داروں کے مال میں سائل اور نادار کا حق ہے اور یہ حکم دے کہ تم جو کچھ بذریعہ کسب حلال کماتے ہو اس میں سے عمدہ مال کو راہ خدا میں صرف کرو وہ کیونکر یہ اجازت دے سکتی ہے کہ دولت جمع کر کے اس کو ضرورت سے زائد زمین اور دیگر ذرائع پیداوار کی شکل میں منتقل کرلو اور پھر اس کو نادار لوگوں کو بٹائی یا کرایہ وغیرہ پر دے کر بلا محنت و مشقت ان کی کمائی میں شریک ہو کر ان کی محنت کا ثمر بٹواتے جاؤ۔ یہ اجازت تو بالبداہت مذکورہ بالا حکم کے منافی ہے۔ اس اجازت سے تو پہلے حکم کا مقصد ہی بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ جس کتاب کی رو سے لین دین میں اپنے حق سے تجاوز کرنا ظلم کے مترادف ہو اس کی رو سے صنعت و تجارت میں منافع خواری کی کھلی چھٹی کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہ تو اس کی اصولی تعلیم کے ہی خلاف ہے۔

غرضیکہ ایک طرف قرآن حکیم کے مذکورہ بالا احکام جو مولانا نے اسلامی نظم معیشت کے ارکان کے زیر عنوان پیش کئے ہیں اور دوسری طرف مولانا کا جائز کردہ سرمایہ دارانہ نظم معیشت جس میں انہوں نے بچت کو جمع کرنے اور جمع شدہ دولت کو مزید دولت پیدا کرنے میں لگا کر بٹائی خواریاں کرایہ خواریاں اور منافع خواریاں کرنے کا جواز قائم کیا ہے کیا امر واقع کے لحاظ سے اور کیا اپنی روح کے اعتبار سے متضاد ہیں۔ لہٰذا دونوں قسم کی تعلیم من جانب اللہ ہو اسلامی نہیں ہو سکتی لازماً وہی تعلیم اسلامی ہو سکتی ہے جس کا ماخذ قرآن مجید ہے وہ تعلیم جس کا ماخذ سرمایہ دارانہ نظم معیشت کی کتب یا رواج یا وہ روایات ہیں جو اسلامی ملوکیت کے زمانہ کی پیداوار ہیں ہرگز اسلامی نہیں ہو سکتی۔ ان کو اسلامی قرار دینا نعوذ باللہ قرآن حکیم کے بنیادی احکام کو بے معنی اور کالعدم سمجھنے کے مترادف ہے۔

المختصر یہ کہ مولانا مودودی صاحب مروجہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام پر ہی اسلام کا ٹھپہ لگا کر اس کو قائم رکھنا چاہتے

ہیں ہاں وہ سرمایہ داری کے داعدار فرسودہ جامہ کو قرآن کریم کی تعلیم کے اشتہار اور زکوٰۃ کے پیوند لگا کر رفو کرنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں مگر سرمایہ دارانہ نظام میں نہ کبھی نظام زکوٰۃ چلا ہے اور نہ چل سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں طریقے اپنی اصل اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی پوری پوری ضد ہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی معاشی زندگی میں یہ دونوں جمع ہو جائیں۔ ایک وہ ذہنیت ہے جس کو روپیہ جمع کرنے اور جمع کر کے مزید غیر مکتسب دولت یعنی کرائے اور منافع حاصل کرنے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں مزا آتا ہے اور دوسری وہ ذہنیت ہے جس کو قوت بازو سے کمانے اور کما کر کھانے اور راہ خدا میں لٹا دینے میں مزا آتا ہے۔ کیا کوئی عاقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ دونوں ذہنیتیں ایک ہی دل و دماغ میں جمع ہو سکیں گی۔ یا ایک ہی نظام میں چل سکیں گی؟

باب سوم

اسلامی نظم معیشت سے متعلق اپنے خیال کا اظہار!

مولانا مودودی صاحب کے پیش کردہ معاشیات پر تبصرہ پڑھنے کے بعد لازماً قارئین کرام مجھ سے سوال کریں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ میرے ذہن میں اسلامی نظم معیشت کا کیا نقشہ ہے۔

جیسا کہ میں نے اُوپر بیان کیا ہے اگر وہ غلط ہے اور اسلام میں زمینداروں کے ذریعہ ناداروں سے بٹائیاں اور صنعت و تجارت میں سرمایہ داریوں کے ذریعہ منافع خواریاں اور کرایہ خواریاں اسی طرح حلال ہیں جیسا کہ مولانا لکھتے ہیں اور اگر اسلامی بنکوں میں محض اپنا ضرورت سے زائد روپیہ دے کر دوسروں کی کمائی میں بلا محنت و مشقت شریک ہو کر منافع کے نام سے سود خواریاں اسی طرح جائز ہیں جیسا کہ مولانا نے بیان کیا ہے۔ اور اگر سرمایہ داری کے بنیادی اصول اسی طرح صحیح اور اسلام کے مطابق ہیں۔ جیسا کہ مولانا نے اپنی کتاب سود میں لکھا ہے۔ تو پھر اسلامی نظام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ رائج اور روز روشن کی طرح جلوہ گر ہے۔ اور کس اسلامی نظام کی تلاش کی ضرورت نہیں لیکن اگر اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا واقعی درہم برہم ہو چکا ہے اور اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں جیسا کہ مولانا مودودی صاحب سود کی تمہید میں لکھتے ہیں تو پھر میرا نہیں بلکہ ہر مسلمان مفکر کا فرض ہے کہ اس کھوئے ہوئے نظام کے اصول و نظریات کلام اللہ سے تلاش کرے۔ بوجہ سرمایہ دارانہ نظام ہم پر مسلط ہونے کے اسلامی نظام کے اصول و نظریات ہمارے دلوں سے تو محو ہو سکتے ہیں لیکن ہمارا سب کا ایمان ہے کہ وہ اصول و نظریات قرآن کریم میں اپنے صحیح مفہوم و روح کے ساتھ موجود ہیں۔ بہرحال میں اپنے ناقص علم کے ساتھ حسب استعداد تمدن و معاشیات کے اصول قرآن مجید سے اخذ کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں:۔

۱- اخوت قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا - اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے پھر فرماتا ہے - إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ - مومن بھائی بھائی ہی تو ہیں - واضح ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اسلام کے ماحصل کی طرف توجہ دلاتا ہے - اور وہ ہے اخوت یعنی اسلامی بھائی چارہ - کیا یہ بھائی چارہ زبانی اور رسمی ہے - یا اس میں کوئی حقیقت بھی ہے یقیناً یہ کوئی رسمی الفاظ نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار ہے -

جو جماعت رسول کریم صلعم نے پیدا کی تھی وہ فی الحقیقت بھائی بھائی بن گئے تھے - تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے ہمدرد و رفیق اور معاون و مددگار تھے - مجھے تاریخ کے وہ اوراق دہرانے کی ضرورت نہیں جو ان کی سیرت و اخلاق اور کارناموں کی گواہی دیتے ہیں کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے - بلکہ میرا مقصد اس اخوت کے اصول کو پیش کرنا ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے معاشرہ قائم کیا تھا - میں چونکہ اس مضمون میں صرف معاشی پہلو کا ذکر کر رہا ہوں لہٰذا میں دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر کے .. .. صرف معاشیات کا پہلو ہی بیان کروں گا -

یہ ایک قاعدے کی بات ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر دو افراد یا دو گروہوں میں مفاد کا ٹکراؤ ہو اور ان کے معاشی نظریات مختلف ہوں تو ان میں کبھی آپس میں اخوت پیدا نہیں ہو سکتی - قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی اخوت اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے مفاد میں ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کر لیا تھا اور وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن گئے تھے - اخوت اور متحدہ مفاد لازم و ملزوم ہیں - اگر اخوت ہو گی تو مفاد متحدہ ہوں گے اور اگر متحدہ مفاد ہوں گے تو اخوت ہو گی - اخوت اور مفاد کا ٹکراؤ دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں - مذکورہ بالا آیات سے واضح ہے کہ اخوت اسلام کا بنیادی اصل ہے لہٰذا کوئی ایسا دستور و آئین یا قانون جو قاطع اخوت ہو اسلام کے منافی ہے - اور ہر ایسا دستور قانون جو اسلامی اخوت قائم کرنے میں ممد و معاون ہو اسلامی و مستند ہو سکتا ہے - اسی کو رائج ہونا چاہیئے - بہرحال اسلامی اخوت کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں معاشرہ - زمیندار، مزارع، کارخانہ دار، مزدور اور تاجر وغیرہ کے متخالف اور متحارب گروہوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے - چونکہ ان میں مفاد کا ٹکراؤ رہتا ہے - لہٰذا وہ اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر مختلف زاویہ نگاہ سے سوچتے ہیں - بدیں وجہ باوجود مسلمان ہونے کے ان میں اخوت اسلامی مفقود ہوتی ہے - اسلامی نظم معیشت کے ماتحت اسلامی معاشرہ میں بموجب ارشاد قرآن کریم متخالف گروہ بندی کو ختم کر کے جمیع مسلمین کے مفاد میں ہم آہنگی اور اتحاد کا پیدا ہونا لازمی امر ہے -

۲۔ شوریٰ | سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت میں پارٹیاں اپنے اپنے مفاد کے پیشِ نظر مجالس قائم کرتی ہیں اور ان کا مشورہ محض اپنے مخصوص فائدے کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں فریقِ ثانی کے فوائد کو نظر انداز ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے وہ نقصان میں رہتا ہے۔ برعکس اس کے قرآن حکیم کا ارشاد ہے اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ۔ یعنی اسلامی برادری کا کام ہے۔ کہ وہ سب کے سب باہم مشورہ سے کام کریں۔ اس میں کسی فرد یا گروہ کے علیحدہ مشورہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسلام تو وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا کے ماتحت گروہ بندی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ تو مسلمانوں کو ایک متحدہ جماعت قرار دیتا ہے۔

پھر اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ایک تنظیم میں منسلک ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر مجالس شوریٰ منعقد ہی نہیں ہو سکتیں، مجالس شوریٰ کا کام محض سیاسی امور سے متعلق ہی نہیں بلکہ آیۂ کریمہ کے منشا کے مطابق ہر اہم اور ضروری امر سے متعلق ہے معاشی مسئلہ جو کہ اس قدر اہم اور پیچیدہ ہے شوریٰ سے باہر نہیں رہ سکتا۔ معاشیات میں ضروریاتِ زندگی کی پیداوار کے لئے تقسیمِ کار۔ رسد اور خرچ کا توازن اور تقسیم و تبادلۂ اشیاء وغیرہ ایسے اہم امور ہیں جو سب کے سب شوریٰ کے محتاج ہیں اور باہمی شوریٰ ہی سے ان کا حل ممکن ہو سکتا ہے۔ پس اسلامی نظمِ معیشت میں شوریٰ مابین جمیع مسلمین ایک اہم رکن ہے۔

۳۔ ملکیت کا تصور | ملکیت کا سرمایہ دارانہ تصور یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی ذاتی ضرورت سے زائد زمین اور سرمایہ پر قبضہ حاصل کرو تاکہ دوسرے نادار لوگ تمہارے دستِ نگر ہوں اور تمہاری ماتحتی اور غلامی پر مجبور رہیں۔ وہ محنت و مشقت کریں اور تم بلا محنت و مشقت محض بحیثیت مالکِ زمین و سرمایہ ان کی کمائی میں شریکِ غالب بن جاؤ۔ مگر اسلام میں ملکیت کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ۔ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ یعنی زمین کل بنی آدم کے لئے مشترک ٹھہرنے اور فائدہ اٹھانے کی جگہ ہے اور جو قدرتی وسائل اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیدا کئے ہیں۔ وہ بھی تمام بنی آدم کے لئے مشترک ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ یعنی جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہے۔ وہ راہِ خدا میں دے دو پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یعنی مومنوں کے مال اللہ تعالیٰ نے جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

نظامِ سرمایہ داری چونکہ ان آیات کے منشا و مقصد کے برعکس چلتا ہے لہٰذا اس نظام میں آیات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یہ آیات وہاں صرف تلاوت کے لئے ہوتی ہیں عمل کے لئے نہیں ہوتیں۔ ان آیات پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب اسلامی نظمِ معیشت کے قیام کا تہیہ کرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ وہ ایک باقاعدہ تنظیم اور قاعدہ و قانون کے ماتحت ان آیات پر عملدرآمد کریں گے۔

۴۔ حرمتِ سود | اسلام میں سود کی حرمت کا حکم اظہر من الشمس ہے۔ سود براہِ راست ہو یا بالواسطہ وہ در حقیقت

ایک ہی چیز ہے

اگر بالواسطہ سود کو جائز قرار دیا جائے گا تو لازماً براہ راست سود کو بھی جائز قرار دینا پڑے گا۔

اسلام کے اصول وارکان معیشت پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہاں کسی قسم کے سود کی گنجائش نہیں۔

۵۔ اکتساب دولت سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سرمایہ لگا کر مختلف قسم کی اشیاء جن میں انسانی محنت بھی شامل ہوتی ہے خریدی جاتی ہیں۔ اور ان کو زیادہ قیمت پر بیچ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سرمایہ کا یہ چکر چلتا رہتا ہے اور اپنی ہر گردش میں سود در سود کی طرح مزید دولت لانے کا باعث ہوتا ہے جس آدمی کو سرمایہ کے یہ چکر راس آجائیں اس کا لکھ پتی یا کروڑ پتی بن جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

اسلام سود کو حرام قرار دے کر سرمایہ داری کے اس چکر کو کاٹ دیتا ہے اور اس کی جگہ حصول دولت کے لئے محنت کو معیار قرار دیتا ہے۔

۶۔ زکوٰۃ اسلامی نظم معیشت کے مندرجہ بالا ارکان کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر معاشیات کا جو ڈھانچہ بنتا ہے۔ اس کی مثال یوں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ایک برادری ہے جس کے افراد مختلف گروہوں میں منقسم نہیں ہیں بلکہ سب مسلم بھائی چارہ میں منسلک ہیں معاشی مسئلہ حل کرنے کے لئے وہ شوریٰ کے ماتحت ضروریات زندگی کی پیداوار کے لئے منظم طریق پر تقسیم کار کرتے ہیں اور اس طرح اپنے رسد اور خرچ کو متوازن کر کے آپس میں منظم طریق پر تبادلہ اشیا کرتے ہیں

سرمایہ دارانہ نظام

تجارت اور اس کی لوٹ کھسوٹ کا وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی وہاں منافع خواروں اور سود خواروں یعنی مختلف قسم کے محنت خوروں کی کوئی جگہ ہے جو سرمایہ دارانہ سماج میں قوم کا خون چوستے ہیں۔ اس برادری کے سب کے سب لوگ محنت کو پیدائشِ دولت کا معیار قرار دے کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق محنت کرتے ہیں۔ برادری کے جس فرد کے پاس ذرائع پیداوار یعنی زمین مشین اور آلات وغیرہ نہیں ہوتے وہ مسلم بھائی چارہ سے ذرائع پیداوار مہیا کرتا ہے جس پر وہ اپنی خداداد قوت سے محنت کر کے دولت پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح اس کا وجود مسلم برادری کے لئے مفید اور موجب خیر و برکت ثابت ہوتا ہے۔

یہ ہے میرے نزدیک اسلام کا وہ نظام معیشت جس میں سود خوری۔ نفع اندوزی۔ کرایہ کشی۔ بٹائی خوری وغیرہ قسم کی غیر مکتسب کمائی کی کوئی گنجائش نہیں اور جو نوع انسان کے لئے موجب ہزار خیر و برکت ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک نظام وہ ہے جسے مودودی صاحب اسلامی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جو دور حاضرہ کے خالص سرمایہ دارانہ نظام کا دوسرا نام ہے قارئین خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ حضرات ہمیں اسلام کے نام سے کس نظام کی طرف لے جانا چاہتے ہیں

قرآن کریم نے اپنے نظام کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے وہ اس قدر صاف اور سادہ ہیں کہ انہیں پیش نظر رکھنے سے کسی قسم کی کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی وہ کہتا یہ ہے کہ

۱۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق پوری پوری محنت کرے۔ لیکن اپنی ضروریات سے زائد کچھ اپنے پاس نہ رکھے (جن کی ضروریات پوری نہ ہوں ان کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوگی)

۲۔ اس طرح جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہے گی تو کسی کو (سود پر) قرضہ دینے زمین خرید کر اسے بٹائی پر چلانے یا فاضلہ مکان بنا کر اسے کرایہ پر چڑھانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ بلکہ تجارت میں بھی محنت سے زیادہ کچھ لینے کی گنجائش نہیں ہوتی

۳۔ اس نظام کی آخری شکل یہ ہوئی کہ ہر فرد معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام پر ہوگی اور افراد معاشرہ اپنی اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق کام کرتے جائیں گے اور یوں اپنی محنت و کاوش سے نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے رہیں گے۔

یہ ہے قرآن کا نظام۔ اس کے علاوہ جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے وہ ذہن انسان کا تراشیدہ ہے جسے قرآن سے کچھ واسطہ نہیں۔

انسان ـــــ نے کیا سوچا؟

(دو ہزار سال میں انسانی فکر کا حاصل)

زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لیے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ـــــ قیمت ـــــ دس روپے

ملنے کا پتہ:

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام 25/B گل برگ کالونی۔ لاہور

باب المراسلات

حلال وحرام

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ مذہب میں حرام اور حلال کے سوال کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اتنی اہمیت کہ اکثر اوقات ایک شے کا حرام ہونا ہی ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتا ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ واضح طور پر معلوم ہو کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے۔ لیکن ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ ایک مولوی صاحب ایک چیز کو حرام بتاتے ہیں۔ دوسرے اسے حلال قرار دیتے ہیں۔ ہم عامی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں۔

براہ کرم واضح طور پر بتائیں کہ قرآن کی رُو سے کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار کسے حاصل ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم۔ ہر انسان۔ محض اپنے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے۔ ۱۷/۷۰) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنالے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔ اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ.... (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اسے ضابطۂ قوانین۔ یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو؛ لہٰذا قرآن کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

۲۔ لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً

(۱) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم نے اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی؛

کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک نیک مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو)، اس قانون کی پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر ایک سخت پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی اُمت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (Authority) ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

۳۔ قرآن نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے۔ حلال کے[1] معنی ہیں، رسیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا۔ اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

بنیادی اُصول

اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ...... (۲/۱۷۲ ـ ۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔

اس نے تم پر صرف مردار اور خون[2] اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے۔ حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۂ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا

[2] سورۂ انعام میں دَمًا مَّسْفُوحًا کہہ کر اس کی تصریح کر دی کہ صرف بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (۶/۱۴۶)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ..... (۷/۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنھیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ..... (۷/۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(ii) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(iii) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(iv) اشیائے رزق میں سے جنھیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

۴۔ ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہ راست کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رُو سے دیئے جو رسول اللہؐ پر نازل ہوئی تھی۔ سورۂ انعام میں ہے۔

قرآن ہی قولِ فیصل ہے

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ ..... (۶/۱۴۶)

(اے رسول ان سے) کہدو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں اس میں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے (مردار بہتے ہوئے خون خنزیر اور اس کے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو)

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام و حلال کا فیصلہ اس وحی کی رُو سے کر دیا ہے جو نبی اکرمؐ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ..... (۲۲/۳۰)

اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمھیں اس وحی کی رُو سے بتلایا گیا

لہ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں کیونکہ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ بتا رہے ہیں کہ قرآن کی رُو سے حرام قرار دینے کی اتھارٹی کونسی ہے۔

ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنایا) جاتا ہے۔

یہ "مَا یُتْلٰی" وہ وحی تھی جو 'الکتاب' میں تھی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ (۲۹/۴۵) "اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے"۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۂ آلِ عمران کی اس آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)۔ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو۔ سورۂ نمل میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنَّمَا اُمِرْتُ ..... اَنْ اَتْلُوَ الْقُرْاٰنَ۔ (۲۷/۹۱) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت[1] کروں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور

(ii) اس نے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۂ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں جس میں پوری تحدی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) "ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟" اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ اس بارے میں اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

کسی اور کو حق حاصل نہیں

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ ..... (۶۶/۱)

اے نبی! جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے، تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔؟

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیر نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا۔

---

[1] تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے بھی ہیں۔

کہ، دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف، خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

حلال وطیب سے مفہوم اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طَیِّبًا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا..... (۲/۱۶۸) "اے نوع انسانی! زمین کی پیداوار جو تم پر حلال کی گئی ہے اسے طیب انداز سے کھاؤ"۔ طیب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مفید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انھیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق۔ میلانِ طبع۔ طبی ضرورت اور دیگر تضمنات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے ناپسند ہے، اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے گویا اس نے اسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف۔ یا عقیدتمندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اس چیز میں کوئی دینی قباحت ہو گی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح، بالواسطہ (indirectly) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے ایسا پہلے ہو چکا تھا اس لئے نبی اکرمؐ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے

نبی کا ذاتی فیصلہ کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انھوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انھوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) "خدا نے حرام قرار دیا تھا" اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ (۳/۹۳) "یہ تمام کھانے (جو اب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے۔ سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا"۔ وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے، (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہو گی۔ اس واقعہ کے پیش نظر، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ اپنے

اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی اُمت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کر لیں۔ اس لئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے، جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث ناتمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۂ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس سورت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیات کبریٰ

سورۂ اعراف کی ایک آیت

کے ضمن میں فرمایا کہ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷) "وہ ان کے لئے طیبات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھیرائے گا"۔ اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(۱) اللہ تعالےٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت و حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(۲) خود نبی اکرمؐ سے بنص صریح کہتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۱) "جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے"

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رُو سے بیان ہوئے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انھیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور کبھی رسول کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچے تھے۔) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ..... (۲/۸۹) "جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں"۔ اور دوسری جگہ ہے وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (۲/۱۰۱)۔ دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے، خدا، وحی۔ کتاب۔ رسول۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔ الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد، اب آیت زیر نظر کو دیکھئے یہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷) یعنی رسول ان کے لئے طیبات کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو

حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورۂ مائدہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ (۵/۸۷) "اے ایمان والو! جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو"۔ یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طیبات کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ (اسی) سورۂ اعراف میں ہے۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ... (۷/۳۳) "اے رسول! ان سے کہہ دے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے ان پر فواحش حرام کئے ہیں"۔ یہاں خود رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام۔

لہٰذا، قرآن نے جہاں حلت و حرمت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ کا مفہوم

اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ.... (۹/۲۹)

(اہل کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھیرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے۔ ان سے جنگ کرو۔

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن میں جہاں "اللہ اور رسول" اکٹھے آتے ہیں وہاں اس سے مراد کیا ہوتی ہے۔ (اس حقیقت کو متعدد مقامات میں واضح کیا جا چکا ہے)۔ اس آیت میں "یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ" سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ عربی زبان میں اور قرآن کریم میں حرّم کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ.... وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ.... (۶/۱۵۲)

اس آیت میں حرّم کے معنی "حرام قرار دیا" کرنے سے سارا مطلب ہی اُلٹ جاتا ہے۔ (مثلاً یہ کہنا کہ اللہ نے والدین پر احسان کرنا حرام قرار دیا ہے۔ بالکل غلط ہے۔) یہاں حرّم کے معنی واجب ٹھہرانے کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ

ان سے کہو کہ آؤ" میں تمھیں پڑھ کر سناؤں کہ تمھارے رب نے تم پر کیا کیا واجب قرار دیا ہے۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھیراؤ۔ اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اور یہ کہ اولاد کو مفلسی کی وجہ سے تباہ نہ کرو۔ اور فواحش کے قریب مت جاؤ۔

لہٰذا سورۂ توبہ کی (مندرجہ بالا) آیت (وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ) کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسول واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انھیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضامند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے

(۲) جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳) خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

سنگین جُرم

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جُرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھیرایا) انھیں حرام قرار دیدیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۵/۸۷)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنھیں اللہ نے تمھارے لئے حلال قرار دیا ہے انھیں حرام مت ٹھیراؤ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کے اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ..... (۱۶/۱۱۶)

اور جو تمھاری زبانیں یونہی جھوٹ بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھو۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ (زیادہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں) اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھیرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب "شریعتِ خداوندی" کے

اِفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ

مطابق ہے۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افترا ہے۔ کذب ہے۔ بہتانِ عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا
قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰/۵۹)

ان سے کہو کہ کیا تم اس پر غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے۔ تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کر دو) یا تم اللہ پر افترا باندھتے ہو۔

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پر افترا باندھتا ہے۔

یہودیوں کو سزا

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پر بطورِ سزا حرام قرار دیدی گئی تھیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ... ذٰ
بِبَغْيِهِمْ ..... (۶/۱۴۶)

اور ہم نے یہودیوں پر سب ناخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دیدیئے تھے۔ اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔

سورۂ نساء میں ہے

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ
لَهُمْ ..... (۴/۱۶۰)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام قرار دیدیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں،

سورۂ نحل میں کہا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے۔ (۱۶/۱۱۸) اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا انھیں حرام قرار دے دینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے

وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ..... (۳/۵۰)

تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دیدی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر لیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالےٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد یہی بتایا ہے کہ

وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ..... (۷/۱۵۶)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرے گا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیگا۔

لیکن انھوں نے قرآن کی بھی مخالفت کی اور اس طرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا جن میں وہ اب تک ماخوذ ہیں۔

توہم پرستی

اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاوٰی کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکین عرب۔ سو ان کے ہاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں جو محض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مویشیوں میں سے فلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے۔ سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۶/۱۳۹)۔ فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۶/۱۳۹) اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے، گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں۔ (۶/۱۴۴) ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمھاری یا تمھارے آباء و اجداد کی مرتب کردہ ہیں (۶/۱۴۴)۔ تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ہو۔ (۶/۱۴۴)۔ اس کے بعد انھیں چیلنج دیا گیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ (۶/۱۵۱)

سند صرف قرآن کی ہے

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے حرام و حلال کے لئے سند صرف حکم خداوندی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اور اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورۂ نساء کی آیات ۲۳-۲۲ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے حلت و حرمت کی پوزیشن جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

ہنگامی تقاضے

آخر میں اتنا اور کہدینا بھی ضروری ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال عارضی طور پر ممنوع قرار دیدے۔ مثلاً برسات (یا ہیضہ) کے زمانہ میں ہیلتھ آفیسر حکم دیدیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے۔ یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کردیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے۔ وقس علیٰ ذالک۔ ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے، اور کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ لہٰذا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (۱۶/۱۱۶)

برقِ طور

بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی بصیرت اور عبرت انگیز داستان

قیمت: ——— چھ روپے

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام — 25/B گلبرگ کالونی — لاہور

باب المراسلات

جُرمِ قتل کی سزا

لاہور کے ایک صاحب نے اگلے دنوں کہا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ شریعت کی رُو سے مقتول کے وارثوں کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مقتول کا خوں بہا لے کر قاتل کو معاف کر دیں معلوم نہیں کہ یہ حکم قرآن کی رُو سے ہے یا فقہ وغیرہ کی رُو سے لیکن اگر اسے قانون بنا کر نافذ کر دیا جائے تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔ کوئی بڑا آدمی جس غریب کو جی چاہے قتل کرا دے۔ مقتول کے ورثا کو (بالخصوص دیہات میں) اس کی جرأت ہی نہیں ہو گی کہ وہ اس بڑے آدمی کی مرضی کے خلاف، قاتل کو معاف نہ کریں۔ وہ معاف کرنے پر مجبور ہوں گے ورنہ ان پر ہزار ستم کی مصیبتیں آ جائیں گی۔ بعض اوقات، زمین وغیرہ پر قبضہ کرنے کے لئے ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کرا دیتا ہے۔ ایسی صورت میں مقتول کا وارث وہی ہوتا ہے جس نے قتل کرایا ہے۔ وہ رسمی طور پر قاتل سے کچھ لے کر (یا بغیر کچھ لئے یونہی) معاف کر دے گا۔ ایسے واقعات بھی آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں کہ ایک بدچلن عورت اپنے شوہر کو قتل کرا دیتی ہے تاکہ وہ اپنے آشنا کے ساتھ چین سے رہ سکے۔ اس صورت میں وہ بیوی مقتول کی وارث ہو گی۔ اور اسے قاتل کو معاف کر دینے کا حق حاصل ہو گا۔ مختصراً یہ کہ اگر مقتول کے ورثا کو معافی کا حق دیدیا جائے قتل کی وارداتیں عام ہو جائیں گی، عدالتیں معطل ہو کر رہ جائیں گی کیونکہ جب آخری حق مقتول کے وارثوں کو ہو گا تو عدالت کا فیصلہ بے معنی ہو گا۔ یوں معاشرہ میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے گا۔

مستفسر نے دریافت کیا ہے کہ قرآن کی رُو سے حقیقت کیا ہے۔

طلوع اسلام قرآن کریم کی رُو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے کہدیا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔ جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا۔ بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر۔ تو یوں سمجھو گویا اُس نے تمام نوع انسانی کو قتل کر ڈالا۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ

جَمِیْعًا (۵/۳۲) اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رُو سے

(۱) جُرم قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے کو قتل کر دے۔ یا ملک میں فساد برپا کر دے، اُسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق (۵/۳۳) میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر انفرادی قتل کے جرم کی طرف آتے ہیں۔

جرم قتل کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے اسے کس قدر سنگین قرار دیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کی روک تھام کی جو تدابیر قرآن نے بتائی ہوں گی وہ اس قسم کی کبھی نہیں ہو سکتیں کہ اُن سے (الٹا) اس جرم کا ارتکاب عام ہو جائے جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی (۲/۱۷۸)۔ "تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے"۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ قِصَاصٌ۔ قصص سے ہے جس کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ہیں۔ لہٰذا قصاص کا مطلب ہوا مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا۔ اُسے ایسے ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔ اس آیت میں خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جماعتِ مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالادست ہو تو پھر صبر شکر کر کے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جُرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ قرآن نے جرم قتل کو "قابل دست اندازیٔ پولیس" قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (..... CROWN VS) لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

۲۔ اس سے آگے ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی۔ اس حصے کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے

کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَ أَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَالِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دیدی جائے تو اسے چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔" ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ "کچھ معاف کر دینا۔ (شَيْءٌ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے "کچھ معاف کر دینے" (اور باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ معاف کر دینے کی شکل اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خوں بہا کہا جاتا ہے۔

۳۔ جرم قتل کی سزا کا ذکر سورۂ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے ارشاد ہے مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً۔ کسی مومن کے یہ شایاں ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا۔ "اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خوں بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔" یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر، بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں، بلکہ خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خوں بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہٰذا سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خون بہا ادا کرنا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۹۲ کے باقیماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہو گی (سزا اس صورت میں بھی خوں بہا ہی مقرر کی گئی ہے۔

۴۔ اس سے اگلی آیت میں ہے وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ (۴/۹۳) "اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے۔ اور اس کی لعنت۔ اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے۔" یہاں قرآن نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا (Capital punishment) بتائی ہے۔ اس میں دیت (خوں بہا) نہیں ہے۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نہایت

ٹھنڈے دل سے سوچا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائے گی۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی ہوئی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت تر ہونی چاہیئے۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے۔ وہ غیرت میں آکر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی۔ جرم کی نوعیت اور احوال وظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا۔ اس سے قیاس کا رُخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن نے قتل عمد کی سزا میں جَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ کے بعد اللہ کا غضب۔ اس کی لعنت۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور قید تنہائی۔ قید بامشقت۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم (Disqualify) کر دینا (لعنت کے یہی معنی ہیں)۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ ممکن ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم، موت (قتل) ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اُسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے ورثاء کا کوئی حمایتی اور مددگار ہی نہیں۔ اس لئے میں اب جس طرح بھی چاہے دندناتا پھروں مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہیئے۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو "سلطان" بنایا ہے۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے ورثاء کا پشت پناہ ہوگا۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷/۳۳) اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا۔ اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اثباتِ جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ "اسراف فی القتل" ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے۔ افرادِ متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جرم، معاشرہ (نظامِ حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے ورثاء کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہٰذا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ

کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

۶۔ اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

(۱) وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً۔ نادانستہ بھول چوک میں۔ غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہذا مقتول اس صورت میں مظلوم کہلائے گا۔ جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

(۲) معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہو گا اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار رہے گا۔

(۳) قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورۂ نساء کی آیت فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور " اللہ کا غضب و لعنت اور عذاب عظیم " وغیرہ اس کے ساتھ یا اس سے الگ۔ یا اس سے نچلے درجے پر۔ " دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

۷۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(۲) جرم قتل، افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہذا مجرم کا پیچھا کر کے اسے سزا دینا مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(۳) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل بلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(۴) قتل خطا کی صورت میں سزا خون بہا (دیت) ہو گی۔ اس کے لئے مقتول کے ورثا کو اختیار ہو گا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کر دیں یا خون بہا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(۵) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہو گی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہو گی۔

(۶) یہ جو کہا گیا ہے کہ "کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔ مگر غلطی سے" تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے۔ قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن۔ کسے باشد۔ ہر ایک کی زندگی قرآن کی رو سے یکساں قیمتی ہے (۵/۳۲) اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں

بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کردے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خوں بہا ادا کرنا ہوگا تاکہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کہلاتا ہوا کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کردے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(viii) قرآن نے انسانی زندگی کی اس قدر قیمت اور اہمیت بتلانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جاسکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو۔ یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر۔ یا دشمن سے جنگ میں۔ یا نظامِ اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے۔ وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ افراد از خود) کہ کیا بالحق کسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مقتولِ مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کردیں۔

امید ہے ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہوگی۔ کہ یہ جو ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے کہ ہر جرمِ قتل میں، مقتول کے وارثوں کو حق حاصل ہے کہ وہ خوں بہا لے کر قاتل کو معاف کردیں، یہ تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے پوزیشن وہ ہے جس کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

قرآن کے عبوری احکام

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

جولائی کے طلوع اسلام کے پرچے میں، دائرۂ اجتہاد کی وسعتوں کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ آپ ایک طرف لکھتے ہیں کہ قرآن کے احکام غیر متبدل ہیں۔ دوسری طرف کہتے ہیں کہ (مثلاً) میراث کے متعلق قرآنی احکام اس زمانہ سے متعلق ہیں جب ہنوز قرآنی نظام قائم نہ ہو۔ جب قرآنی نظام قائم ہو جائے گا اس وقت میراث کی تقسیم سے متعلق قوانین کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کیا یہ چیز احکام میں تبدیلی کے مرادف نہیں؟

طلوعِ اسلام

جی نہیں۔ احکام میں تبدیلی اور پیش کردہ مثال میں بنیادی فرق ہے۔ قرآن کے بعض احکام بعض شرائط (Conditions) کے ساتھ مشروط ہیں۔ جب تک وہ شرائط موجود رہتی ہیں وہ احکام نافذ العمل رہتے ہیں۔ جب وہ شرائط باقی نہیں رہتیں وہ احکام ساقط العمل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ

(i) جب پانی موجود ہو (اور تم مریض نہ ہو) تو وضو کیا کرو۔ اور

(ii) جب پانی موجود نہ ہو (یا تم مریض ہو) تو تیمم کر لیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ جب تک پانی موجود ہے (اور انسان تندرست ہے) تو وضو کا حکم نافذ العمل رہے گا اور تیمم کا حکم ساقط العمل۔ لیکن جب پانی نہ ملے (یا انسان بیمار ہو) تو وضو کا حکم ساقط العمل ہو جائے گا۔ اور تیمم کا حکم نافذ العمل ہو جائے گا۔ ان دونوں

صورتوں میں کسی حکم میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ جن شرائط کے ماتحت ایک حکم جاری رہنا تھا ان کے بدل جانے سے، وہ حکم ساقط العمل ہوگیا اور اس کی جگہ اس حکم نے لے لی۔ جسے قرآن نے موجودہ شرائط کے لئے دیا تھا۔

یہی صورت عبوری دور سے متعلق احکام کی ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ جو کچھ کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد ہو، اسے "فی سبیل اللہ" خرچ کرنے کے لئے اسلامی نظام کو دیدے۔ ظاہر ہے کہ جب معاشرہ اس حکم پر عمل پیرا ہوگا تو معاشرہ میں کسی کے پاس فاضلہ دولت نہیں رہے گی۔ جب فاضلہ دولت نہیں ہوگی تو جائیداد بنانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں کسی مرنے والے کے پاس دولت یا جائیداد نہیں ہوگی۔ جب دولت اور جائیداد ہی نہیں ہوگی تو ترکہ کی تقسیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا) اور جب ترکہ کی تقسیم کا سوال پیدا نہیں ہوگا تو ترکہ کی تقسیم سے متعلق قرآنی احکام خود بخود ساقط العمل ہوجائیں گے۔

اس کے برعکس جب اَلْعَفْو (ضرورت سے زائد) مال کو نظام کے سپرد کر دینے کا حکم جاری (Inforce) نہیں ہوگا تو مرنے والے ترکہ چھوڑیں گے۔ اس ترکہ کی تقسیم قرآن کے قانون میراث کے مطابق ہوگی۔ ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

امید ہے اس مختصری وضاحت سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ احکام میں تبدیلی کر دینے اور ان شرائط یا حالات کے باقی نہ رہنے کی صورت میں (جن کے لئے وہ احکام دیئے گئے تھے) ان احکام کے ساقط العمل ہوجانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے نزدیک قرآنی احکام میں تبدیلی کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ قرآن کے اصول اور قوانین سب غیر متبدل ہیں اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللہ کے حکم میں شامل۔

نِظامِ رُبُوبیّت

نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا؟ اور قرآن نے اس کا حل کیا بتایا ہے۔ دورِ حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑے سائز کے ۲۸۰ صفحات

قیمت قسم اول مجلّد چھ روپے — قسم دوم غیر مجلد چار روپے

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام — 25/B گل برگ — لاہور

الیکشن کی تیاریاں

انتخابی منشورات

اگرچہ آئندہ انتخابات کی تاریخوں کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ (بلکہ آخری اطلاعات کے مطابق اسے فروری ۱۹۵۹ء تک ملتوی کر دیا گیا ہے) لیکن مختلف جماعتوں کی طرف سے انتخابی منشورات شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس وقت تک تحریک جمہور ملت پاکستان اور جماعتِ اسلامی کی طرف سے منشور کی کاپیاں موصول ہوئی ہیں۔ تحریک جمہور ملت کا منشور ایک مختصر سا پمفلٹ ہے جس کے پہلے صفحے پر تحریک کا نصب العین حسب ذیل الفاظ میں درج ہے۔

تحریک جمہور ملت کا منشور

تحریک جمہور ملت کا نصب العین ایک زندہ اور مضبوط اسلامی نظام معاشرہ کے لئے انقلاب برپا کرنا ہے جس میں ہماری زندگی کے روزمرہ مسائل کا حل قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کے لحاظ سے کیا جائے یعنی ایک ایسا معاشرتی نظام جو انسانی زندگی کے مستقل اقدار اور اس کی تغیر پذیر صورتوں سے مطابقت رکھتا ہو۔

یہ نصب العین صاف اور واضح ہے اور (ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق) قرآنی منشار کے عین مطابق۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر لکھا تھا، ہمارے دور کا بالعموم اور پاکستان کا بالخصوص بنیادی مسئلہ معاشی ہے اور اسی مسئلہ کے صحیح حل پر ملک کی موت اور حیات کا دار و مدار ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک مختلف جماعتوں کے منشورات میں بنیادی طور پر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے معاشی مسئلہ کا حل کیا رکھتی ہیں۔ تحریک جمہور ملت کے منشور میں، اس عنوان کے تحت لکھا ہے

تحریک کی جدوجہد کا مرکزی نقطہ ایک خوشحال اور صحت مند معاشرے کا قیام ہے۔ اس معاشرے میں دولت و رزق کے سرچشموں پر تمام افراد مملکت کو مساوی حق حاصل ہوگا۔ تحریک ان سرچشموں کو مملکت کی تحویل میں

لائے گی۔ اس مقصد کے لئے اولین اقدام کے طور پر وہ بے دخل مزارعین کی فوری آبادکاری کا سامان پیدا کرے گی۔ اور اس امر کے درپے ہوگی کہ بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے پاس اسی قدر اراضی باقی رہے جو ان کی ضروریات زندگی کی کفیل ہو۔ بقیہ اراضیات ضرورتمند اور مستحق کاشتکاروں میں تقسیم کردی جائیں گی۔ جہاں تک بڑے بڑے کارخانہ داروں کا تعلق ہے کارخانوں کی آمدنی میں ان کی ضروریات زندگی کے مطابق حصہ طے کرکے بقیہ آمدنی کو متعلقہ مزدوروں کا حق قرار دیا جائے گا۔ غرضیکہ تحریک ایک ایسے ماہرانہ اور جامع قومی منصوبے کی عملی تکمیل کے درپے ہوگی جس سے ملک کی اجتماعی دولت پیداوار کی غلط تقسیم کو ختم کرنا اور ہر پاکستانی کو اس کی بنیادی ضروریات (خوراک، مکان، علاج، تعلیم اور کام) اس کے حق کے طور پر بلا تکلیف مہیا کرنا حکومت کا فریضہ ہوگا۔

یہ شق بھی قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ملک میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو قرآن کے معاشی نظام کو اپنا نصب العین قرار دیئے ہوئے ہے۔

اس کے بعد "لوٹ کھسوٹ سے نجات" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔

تحریک ہوس زرگری کے اس تندوتیز رجحان کی جو کاروباری لوٹ کھسوٹ، چوربازاری اور رشوت ستانی کی صورت میں شب و روز شدت اختیار کر رہا ہے پرزور مذمت کرتی ہے اور اسے ان بنیادی نظریات سے بیخبری اور روگردانی کا نتیجہ قرار دیتی ہے جو اسلامی معاشرے کی اساس ہیں۔ تحریک جہاں عوام کی ذہنی تربیت کے سامان پیدا کرے گی وہاں نفع اندوزی کے ان راستوں کو قانونی اور آئینی طور پر بند کرنے کی ہرممکن کوشش کرے گی تاکہ امیر امیرتر اور غریب غریب تر نہ ہونے پائیں۔ بلکہ معاشرہ معاشی مساوات کی خوشگواریوں سے بہ تمام و کمال مالامال ہو سکے۔

"حقوقِ نسواں" کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

تحریک اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے مردوں کے دوش بدوش عورتوں کی صلاحیتوں کا نشوونما وارتقاً لازمی قرار دیتی ہے۔ وہ انہیں ان بندھنوں سے جو بدقسمتی سے اس وقت ہمارے معاشرے میں مروج ہیں نجات دلاکر مساویانہ معیار کی اس سطح پر لانے کی کوشش کرے گی جو قرآن نے ان کے لئے متعین کی ہے۔ اور جو شرف انسانیت کی محکم ترین ضامن ہے۔ تحریک ترکہ و وراثت کے شرعی قوانین کے تحت جائیداد کے معاملے میں خواتین کے طے شدہ حقوق کی محافظ ہوگی اور جن مقامات پر یہ قوانین رائج نہیں وہاں انہیں رائج کرنے کی انتہائی جدوجہد کرے گی۔ نیز کوشاں ہوگی کہ میرج اینڈ فیملی لاکمیشن کی سفارشات موجودہ لاکمیشن کے ذریعہ جلد از جلد تکمیل کو پہنچیں اور نکاح و طلاق کے تنازعات میں ناقص قوانین اور غلط رسوم ورواج کی بنا پر ہمارا معاشرہ جن گوناگوں خانگی تلخیوں کا شکار بن چکا ہے ان سے بچاؤ کی خوشگوار صورت

قانونی طور پر پیدا ہو۔

تحریک جنسی بے راہ روی اور عصمت فروشی کے تمام راستوں کو معقول تدابیر اور مؤثر قوانین کے ذریعے بند کر کے ایک ایسی فضا کی تخلیق کے لئے سرگرم کار ہوگی جو احترام آدمیت کی صحیح آئینہ دار ہو اور جس میں ایک جنس دوسری جنس کی خواہش براری کا ذریعہ بن کر نہ رہ جائے۔

بہرحال، بہ ہیئت مجموعی اس مختصر سے منشور میں جو کچھ کہا گیا ہے (اور حقائق پسند جماعتوں کا منشور ہونا ہی مختصر اور قابل عمل چاہیئے) اس سے ظاہر ہے کہ یہ تحریک جن عزائم و مقاصد کو سامنے رکھ کر انتخاب میں حصہ لینا چاہتی ہے وہ بڑے مبارک اور مسعود ہیں۔

۲۔ جماعت اسلامی کا منشور

جماعت اسلامی کا منشور مؤقر مجلہ ترجمان القرآن کی جون ۱۹۵۸ء کی اشاعت کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ ابتدائی سولہ صفحات میں منشور پر تبصرہ ہے اس کے بعد ۳۲ صفحات پر منشور پھیلا ہوا ہے۔ جس میں جماعت کی جدوجہد کا مرکزی نقطہ "پاکستان کی سیاسی قیادت کو ایک صالح قیادت میں بدلنے کا عزم ہے۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

اس جدوجہد میں اس (جماعت اسلامی) کے پیش نظر اپنا اقتدار نہیں بلکہ ان اصولوں کا اقتدار ہے جن پر اس کا اور ساری امت کا ایمان ہے۔ وہ گمراہ اور آزمودہ غلط کار لوگوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کو انتخاب کے لئے قوم کے سامنے لانا چاہتی ہے جو دین دار بھی ہوں اور دیانت دار بھی۔ اور اس کے ساتھ نظام حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔

بڑی مبارک بات ہے لیکن دین دار کے ساتھ "دیانت دار" کی شرط عجیب ہے۔ گویا ایسے دین دار بھی ہو سکتے ہیں جو دیانتدار نہ ہوں۔ جس دین کو اسلام کہا جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی دین دار ایسا نہیں ہو سکتا جو دیانتدار نہ ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے

جماعت اسلامی (خود) ایمانداری کے ساتھ اخلاق کے اصولوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہوئے۔ یہ انتخابی جنگ لڑنا چاہتی ہے۔

لیکن جماعت کے امیر تو اس کا اعلان فرما چکے ہیں کہ ایک بلند مقصد کے حصول کے لئے اگر جھوٹ بولنا اور فریب دینا ضروری ہو تو ایسا کرنا نہ صرف شرعاً جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تطبیق کی صورت دکھائی نہیں دیتی لیکن یہ تضاد رفع ہو جاتا ہے، جب مودودی صاحب کے اس اصول، کو بھی سامنے رکھا جائے کہ جو کچھ ایک جماعت نظری اور تبلیغی طور پر کہے ضروری نہیں کہ عملی میدان میں اترتے وقت بھی اس کی پابندی کرے۔ لہٰذا انتخابات میں اخلاقی ضابطہ کی پابندی

محض منشور کی زینت کے لئے ہے۔ علاوہ سب کچھ کیا جائے گا جو حصولِ مقصد کے لئے ممد و معاون ہو۔

(۳) منشور میں اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں لیکن چونکہ ہم معاشی پروگرام کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں اس لئے سب سے پہلے اسی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں منشور میں لکھا ہے۔

دوسرے شعبوں کی طرح معیشت کے شعبہ میں بھی ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ایک طرف ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اور دوسری طرف اپنے ملک کے حالات وضروریات کو مدنظر رکھ کر معاشی نظام کی از سرِ نو تعمیر کریں۔ اس سلسلہ میں ہمارا پروگرام حسب ذیل ہے۔

الف زرعی اصلاحات

۱۔ ملک میں خوراک کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں گی، تاکہ آئندہ پانچ سال کے اندر خوراک کی پیداوار میں تقریباً پچاس فی صدی اضافہ ہو جائے۔

(۱) افتادہ قابلِ کاشت زمینوں کو زیرِ کاشت لانا۔

(۲) بنجر زمینیں جو اصلاح کے قابل ہوں، انھیں قابلِ کاشت بنا کر زیرِ کاشت لانا۔

(۳) سیم اور شور کے پھیلاؤ کو روکنا، اور ان سے متاثر شدہ زمینوں کی اصلاح کرنا،

(۴) بہتر قسم کی کھاد اور کھیتی باڑی کے ترقی یافتہ وسائل اور طریقوں کو رواج دینا۔

(۵) آبپاشی کے موجود اور ممکن وسائل کو پوری طرح استعمال کرنا۔

(۶) کیڑوں سے فصلوں کو محفوظ کرنا، سمندری پانی سے زمین کو بچانا اور دوسرے ان اسباب کو رفع کرنا جو پیداوار کی کمی کے موجب ہوتے ہیں۔

(۷) نقد آور فصلوں (cash-crops) اور خوراک پیدا کرنے والی فصلوں کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا۔

۲۔ تمام ایسی زمینداریوں کے متعلق جو دو سو ایکڑ نہری وچاہی یا چار سو ایکڑ بارانی سے زیادہ رقبے کی ملکیت پر مشتمل ہوں، تحقیقات کی جائے گی کہ ان میں سے کون شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے جائز ملکیت کی تعریف میں آتی ہے اور کون اس تعریف میں نہیں آتی۔

جو زمینداریاں اس تعریف سے خارج پائی جائیں گی ان کا صرف دو سو ایکڑ نہری وچاہی یا ۴۰۰ سو ایکڑ بارانی حصہ موجودہ قابضوں کے پاس رہنے دیا جائے گا، باقی ماندہ رقبے بلا معاوضہ ان کے قبضے سے نکال کر مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے اور استحقاق میں ان لوگوں کا حق مقدم رکھا جائے گا جو فی الحال ان زمینوں میں کاشت کر رہے ہیں۔

جو زمینداریاں جائز ملکیت قرار پائیں گی انھیں ایسے قوانین کا پابند بنایا جائے گا جن سے وہ تجارتی مضاربت کی طرح مالک اور مزارع کے درمیان محض ایک زراعتی شرکت کی حیثیت اختیار کر لیں اور ظلم و جور کا ذریعہ نہ بن سکیں۔ نیز قانون میں یہ صراحت کی جائے گی کہ ہر ایسی زمینداری قابلِ ضبطی ہے جو آلۂ ظلم بن گئی ہو، یا ریاست کے اندر ایک ریاست کی شکل اختیار کر رہی ہو۔ یا جسے ناجائز طریقوں سے سیاسی قوت و اثر حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہو۔

۳۔ تمام ایسی جاگیروں کے متعلق بھی، جو دو سو ایکڑ نہری و چاہی یا ہم سو ایکڑ بارانی سے زیادہ رقبے پر مشتمل ہوں، یہ تحقیقات کی جائے گی کہ وہ کن خدمات کے صلے میں یا کن خدمات کے لئے دی گئی تھیں۔ ان میں سے جو بھی ملک کے حقیقی مفاد کے سوا کسی اور خدمت کی خاطر دی گئی ہو اسے واپس لے لیا جائے گا، اور اس کے موجودہ قابضوں کی معقول کفالت کے لئے ایک مناسب رقبہ ان کی ملکیت میں دیدیا جائے گا۔ جو کسی حالت میں دو سو ایکڑ نہری و چاہی یا چار سو ایکڑ بارانی سے زیادہ نہ ہوگا۔

۴۔ جو اراضی دراصل وقف کے طور پر مختلف زمانوں میں دی گئی ہیں ان کو شخصی قبضہ و تصرف سے نکال کر شرعی قانونِ وقف کے تحت لایا جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ان لوگوں کی کفالت کے لئے معقول انتظام کر دیا جائے گا جن کی معیشت اب تک اس ذریعے پر منحصر رہی ہے۔

آپ اس اسکیم کے عملی پہلو پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس کے انجام و عواقب کیا ہوں گے؟ ہوگا یہ کہ جب جماعتِ اسلامی برسرِ اقتدار آئے گی تو تمام ملک کی زمینداریوں کے متعلق جو ایک خاص رقبہ سے زیادہ ہوں گی تحقیقاتی کمیٹی بٹھائے گی کہ وہ فیصلہ کرے کہ کونسی زمینداری "شریعتِ اسلامیہ" کی رو سے "جائز ملکیت" کی تعریف میں آتی ہے اور کونسی اس تعریف میں نہیں آتی۔ جس طرح جماعتِ اسلامی نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ کتاب کے ساتھ جو وہ "سنت" کا اضافہ کرتے ہیں تو "سنت" سے ان کی مراد کیا ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کبھی نہیں بتائے گی کہ "شریعتِ اسلامی" سے متعین مفہوم کیا ہے؟ جس طرح "سنت" سمٹ سمٹا کر ان کے امیر کی نگہ "رسول شناس" کا نام رہ جاتی ہے، اسی طرح "شریعتِ اسلامی" بھی انہی کے آمرانہ فیصلوں سے عبارت ہوگی۔ اس طرح ملک کے تمام زمینداروں کی جان ان کی مٹھی میں ہوگی کہ جس کی زمینداری کو چاہا جائز قرار دے دیا۔ جسے چاہا ناجائز ٹھیرا دیا۔

ناجائز زمینداریوں کے متعلق تجویز یہ ہے کہ ان میں سے صرف دو سو ایکڑ نہری و چاہی یا چار سو ایکڑ بارانی، موجودہ قابضوں کے پاس رہنے دی جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ جس مال کو آپ از روئے شریعت ناجائز قرار دیتے ہیں، وہ کونسا اصولِ شریعت ہے جس کی رو سے اس کے قابض کو اس قدر حصے کا جائز مالک بنا لیتے ہیں؟ ناجائز مال کی تو ایک پائی بھی ناجائز ہی ہوگی۔ کہہ دیا جائے گا کہ ناجائز مالکوں کو اس قدر رقبہ اس لئے دیا جائے گا کہ اس سے ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔

ٹھیک ہے۔ ان کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا ضروری ہے لیکن اس کے لئے دو سو ایکڑ نہری اراضی کیوں؟ اس منشور میں ذرا آگے چل کر لکھا ہے کہ

> کاشتکار کو کم از کم اتنا قطعۂ زمین اور اتنا حصۂ پیداوار لازماً دیا جائے جو بلحاظ اوسط اس کی بنیادی ضروریات کے لئے کفایت کر سکے۔

یعنی ایک دیانتدار محنت کرنے والے کاشتکار کو تو صرف اتنا دیا جائے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکیں اور ایک "چور ابنِ چور" کو دو سو ایکڑ نہری اراضی دی جائے!

دیکھا آپ نے جدید شریعت کا قانونِ عدل؟

جہاں تک جائز ملکیتوں کا تعلق ہے، جماعتِ اسلامی از روئے شریعت ان پر کسی حدبندی (Limitation) کو جائز نہیں سمجھتی۔ یعنی ایک شخص ایک لاکھ ایکڑ زمین کا بھی مالک ہو سکتا ہے۔ اس ایک لاکھ ایکڑ زمین پر جو دس ہزار مزارعین دن رات محنت کریں گے انھیں تو صرف پیٹ پالنے کے لئے ملے گا اور جو شخص سال بھر تک انگلی نہیں ہلائے گا وہ نصف پیداوار کا مالک بن کر عیش اڑائے گا۔ یہ ہے "زراعتی شرکت" کا وہ قانون جس کے متعلق منشور میں کہا گیا ہے کہ "ظلم و جور کو مٹائے گا۔ یعنی ایک کاشتکار کی محنت کی کمائی سے بغیر کچھ کئے آدھا لے جانا "ظلم و جور" نہیں۔

یہ ہے مغرب کا وہ خالص نہایتی سرمایہ دارانہ نظام جسے پاکستان میں "شریعتِ حقہ" کے نام سے کتاب و سنت کا ٹھپہ لگا کر رائج کیا جائے گا۔

وقف کی اراضیات کے متعلق منشور میں کہا گیا ہے کہ "انھیں شخصی قبضہ و تصرف سے نکال کر شرعی قانونِ وقف کے تحت لایا جائے گا"۔ معلوم نہیں "شرعی قانونِ وقف" سے کیا مراد ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم سے تو وقف کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔ وہ مُردوں کو کبھی یہ اختیارات نہیں دیتا کہ وہ تا قیامت زندہ انسانوں پر اپنا حکم چلائیں (وقف کے یہی معنی ہوتے ہیں) وہ ترکہ پانے والوں کو متوفی کے مال کا مالک قرار دیتا ہے۔

جیسا کہ طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم کی رُو سے زمین جو نوعِ انسانی کے لئے ذریعہ رزق ہے کسی فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ اُمت کی مشترکہ تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے، قانونِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی پرورش کا انتظام کر سکے۔ لہٰذا کوئی ایسا نظام جو رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیت میں دیتا ہے، اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت یہ (سرمایہ دارانہ) نظام پاکستان کے اربابِ ثروت و اقتدار، اور پاکستان کے حلیف ممالک کی منشا کے مطابق ہے لیکن اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو اس نظام کے قیام یا استحکام کی کوشش درحقیقت کمیونزم کے لئے دعوت۔ فلہٰذا روس کی مرضی کے عین مطابق ہے۔ جن مسلم ممالک میں یہ نظام موجود تھا ان کا جو انجام ہوا اور ہو رہا ہے اسے ہمارے لئے آیۂ عبرت ہونا چاہیئے۔ ہم پورے اعتماد اور وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جو فرد یا جماعت، پاکستان میں اس قسم کے

سرمایہ دارانہ نظام کے قیام و بقا کے لئے کوشاں ہے، وہ اسلام کی سب سے بڑی مخالف اور پاکستان کی سب سے بڑی دشمن ہے اور اس کے ساتھی ہی کمیونزم کو آواز دینے میں سب سے پیش پیش۔

معاشی نظام کے سلسلہ میں ٹیکسوں کا سوال آتا ہے۔ منشور میں اس ضمن میں لکھا ہے

ٹیکس عائد کرنے کی پالیسی میں ایسی اصلاح جس سے قومی دولت قومی معاشرہ کے تمام افراد میں انصاف کے ساتھ تقسیم ہو اور دولت و خوش حالی چند خوش نصیبوں کا اجارہ بن کر نہ رہ جائے۔

(۲) حکومت کی طرف سے زکوٰۃ و صدقات اور عام رفاہی اغراض کے لئے فی سبیل اللہ اعانتیں وصول کرنے کا انتظام۔ یہ فنڈ شرعی قواعد کے مطابق حسب ذیل کاموں پر صرف ہوگا (مثلاً) غریبوں محتاجوں ضعیفوں۔ اور اپاہجوں کو مالی سہارا اور پنشن (اس قسم کی بہت سی مدات کا منشور میں ذکر ہے)

یعنی ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ الگ ہوگی اور ٹیکس الگ ہوں گے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ کتاب و سنت میں (زکوٰۃ کے علاوہ) ٹیکس کے لئے کیا لفظ آیا ہے؟

ملازمین کی تنخواہوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ

کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین کی شرح تنخواہ اور شرح پنشن (کے سلسلہ میں) یہ قاعدہ ملحوظ رکھا جائے گا کہ ملازم کو لازماً اتنی تنخواہ ملنی چاہیئے جس میں اوسطاً پانچ افراد کے ایک خاندان کی بنیادی ضروریات (غذا۔ لباس مکان۔ تعلیم۔ علاج) پوری ہو سکیں۔

سوال یہ ہے کہ یہی قاعدہ بڑی تنخواہ پانے والوں کے ضمن میں بھی کیوں نہ ملحوظ رکھا جائے؟ واضح رہے کہ منشور میں یہ بھی لکھا ہے کہ کم از کم تنخواہ ایک سو روپیہ اور زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہوگی۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ تین ہزار کس قاعدے کی رُو سے تجویز کی گئی ہے۔

چونکہ یہ منشور انتخاب لڑنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے اور انتخاب جیتنے کا اولین گُر یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت کو خوش رکھا جائے اس لئے اس میں سستی شہرت (Cheap popularity) حاصل کرنے کے وافر سامان رکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً

حج کے سفر سے ان تمام ناروا پابندیوں کو دور کرنا جو جہازوں کی قلت اور زرمبادلہ کی کمی کے بہانے عائد کی گئی ہیں..... حاجیوں کی روانگی اور واپسی کے لئے ریلوں کے کرائے میں رعایت اور اسپیشل ٹرینیں چلانے کا انتظام

عوام کو خوش کرنے کا یہ حربہ بڑا موثر ہے ورنہ ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ اتنے بیوقوف نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ اگر حج کے لئے کھلی اجازت دیدی جائے تو جہازوں کی دقت تو ایک طرف، جس قدر زر مبادلہ حکومت پاکستان سال بھر میں حاصل کرتی ہے وہ تمام کا تمام بھی حاجیوں کے لئے کافی نہیں ہو سکے گا۔

سستی شہرت کے ضمن میں ذیل کی تجاویز بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

سرکاری افسروں کے لئے سرکاری ڈیوٹی کے دوران۔ نیز سرکاری تقریبات میں انگریزی لباس کو ممنوع قرار دینا..... اور اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی موثر کرنا۔

گویا لباس کی وضع قطع اور اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی بھی اسلام کے اجزا ہیں! معلوم نہیں اگر انگلستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو جماعت اسلامی ان کے لئے کونسا لباس تجویز کرے گی؟

یہ تو ہے سستی شہرت کے حربے۔ اس کے بعد پراپیگنڈے کی مشینری کو لیجئے۔ سو اس کے لئے مسجدیں پہلے سے موجود ہیں جنہیں نہایت آسانی سے ہاتھ میں لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ منشور میں لکھا ہے۔

مساجد کو تہذیب ملت کے مراکز بنانے کے لئے ائمہ وخطبا کی تعلیم وتربیت کا انتظام۔ ان کو باعزت طریقے سے معاوضے دلوانے کا انتظام۔

لیجئے ہزار ہا درکرآپ کے لئے حاضر ہیں۔

یہ ہیں چند موٹی موٹی شقیں اس منشور کی جسے لے کر یہ جماعت میدان میں آئی ہے۔ خدا حافظ ہے اس ملک کا جس کی زمام اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے، بالخصوص جب وہ ایک بلند مقصد کے حصول کے لئے جھوٹ اور فریب کو بھی نہ صرف جائز بلکہ واجب سمجھتے ہوں۔

اسلامی معاشرت

از پرویز

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گل برگ کالونی — لاہور

رابطہ باہمی

(بزمہائے طلوع اسلام کیلئے)

محاسبہ خویش لغات القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں، راولپنڈی کنونشن میں، مختلف بزموں کی طرف سے، بطیب خاطر، کچھ رقوم کا وعدہ ہوا تھا۔ پھر سن لیجئے کہ اس کے لئے نہ کسی نے مطالبہ کیا تھا نہ زور ڈالا تھا۔ بزموں نے ازخود رضاکارانہ طور پر اس اعانت کا وعدہ کیا تھا۔ بزموں کے علاوہ، بعض احباب نے انفرادی طور پر کچھ وعدے کئے تھے۔

افراد نے اپنے وعدوں کو کس حد تک پورا کیا ہے اور بزموں نے کس حد تک، اس کا اندازہ اس فہرست سے لگ سکتا ہے جو طلوع اسلام میں شائع ہوتی چلی آرہی ہے۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) افراد کی طرف سے وعدوں کی میزان -/8/23,394 (۲) بزموں کی طرف سے وعدوں کی میزان -/-/28,041

وصولی —	-/8/21,922	وصولی —	14,509
بقایا —	1472	بقایا —	13,532

اس آئینے کے پیش کر دینے کے بعد ہم کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

حدی راتیز ترمی خواں بزموں سے درخواست ہے کہ وہ اشاعت زیر نظر کے لمعات کا بغور مطالعہ کریں اور سوچیں کہ اس باب میں ان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ دیگر احباب سے تو ہم صرف استدعا کر سکتے ہیں لیکن بزموں نے اس امر کا وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ نظام ربوبیت کے تصور کو عام کرنے میں ہر ممکن کوشش کریں گے۔ آپ سوچ لیجئے کہ آپ نے اس وعدے کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ واضح رہے کہ جن لوگوں نے قرآنی نظام ربوبیت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھ لیا ہے، ان پر یہ ذمہ داری ایک اہم فریضہ کی حیثیت سے عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ حد تک عام کریں۔

آپ اپنی بزم کی میٹنگ جلد از جلد بلایئے اور طے کیجئے کہ اس ضمن میں آپ اپنی کوششوں کو کس طرح تیز تر کر سکتے ہیں۔ اس میں بالکل توقف نہ کیجئے۔ اس نظام کے علاوہ ملک کی نجات کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اگر ہم اس فکر کو عام نہ کر سکے تو ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب ہم پر بھی مسلط ہو جائے جس میں قرآن کا نام لینا سخت جرم قرار پا جائے۔ سوچئے کہ اُس وقت ہماری حالت کیا ہوگی؟

بزموں کی روئداد

چونکہ اب کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے اس لئے ادارہ چاہتا ہے کہ اسے معلوم ہوتا رہے کہ بزمیں اس ضمن میں کیا کر رہی ہیں۔ فیصلہ یہ ہے کہ کارروائی کی رپورٹ کا ہر بزم کی طرف سے آنا لازمی ہے۔ اگر کسی بزم نے مہینہ بھر میں کچھ نہیں کیا تو وہ اپنی رپورٹ میں اس کا اعتراف کرے لیکن رپورٹ بھیجے ضرور۔ اسے بلینک رپورٹ (Blank Report) کہا جائے گا۔

اگر کسی بزم کی رپورٹ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک ادارہ کے پاس نہ پہنچی یا اس کی رپورٹ مسلسل "بلینک" رہی۔ تو ادارہ اس بات پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس بزم کی منظوری کو کیوں نہ منسوخ کر دیا جائے۔ ضرورت فعال بزموں کی ہے۔ گنتی پوری کرنے کی نہیں۔

نمائندوں کا اجتماع

تمام بزموں کے نمایندگان کا غیر رسمی اجتماع (جس کی تجویز ۲ جولائی کے لئے کی گئی تھی) موسم کے خوشگوار ہونے تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ لاہور میں پندرہ ستمبر سے موسم بہتر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اکتوبر کے شروع میں بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ بزموں کو تاکیداً لکھا جاتا ہے کہ وہ ۲۵ اگست تک اطلاع دیں کہ ان کے لئے پندرہ ستمبر کے بعد آنے میں سہولت رہے گی یا اکتوبر میں۔ آخری فیصلہ جوابات کی روشنی میں کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس اجتماع میں ہر بزم کو ایک نمایندہ لازماً بھیجنا ہوگا۔ اجتماع یک روزہ ہوگا اور شرکاء ادارہ کے مہمان ہوں گے۔

باہر سے آنے والے حضرات

اکثر احباب بیرونجات سے محترم پرویز صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ پرویز صاحب صبح کے اوقات میں کام میں منہمک ہوتے ہیں اس لئے اس وقت ان سے ملاقات کرنا ملت کا اجتماعی نقصان کرنا ہے۔ ملاقات کا وقت تیسرے پہر (چار پانچ بجے کے بعد) مناسب رہتا ہے۔ ملنے والے احباب اگر ناظم ادارہ سے ٹیلی فون پر وقت مقرر کر لیں تو انہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ اتوار کے دن وہ نہیں مل سکتے۔

ادارہ کے دفتر کے اوقات

صبح ۹ بجے سے بارہ بجے تک۔ اور دوپہر ۲ بجے سے ۵ بجے تک۔
(اتوار کے دن دفتر بند رہتا ہے)

ادارہ طلوعِ اسلام اور قرآنک ریسرچ سنٹر کا ٹیلیفون نمبر 7500 ہے نوٹ کر لیجئے

شعلۂ مستور

چھپ کر تیار ہے

حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ پیشوائیت۔ غرضیکہ ہر نوع کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے خلاف اعلانِ جنگ ہوتی تھی۔ وہ باطل کے ان خرمنوں پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور انہیں خس و خاشاک بنا کر رکھ دیتی۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی لیکن انسانی تحریف نے آپ کو ایک فقیرِ بے نوا کی حیثیت دیدی جس کی پکار یہ ہو کہ کسی طاغوتی قوت کا مقابلہ مت کرو اور جو تمہارا کوٹ اتارے اسے اپنی واسکٹ خود اتار کر دے دو۔

محترم پرویز صاحب کی تحقیق نے، قرآن اور تاریخ کی روشنی میں، انسانی تحریک کے ان تمام پردوں کو چاک کر کے جناب مسیحؑ کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے جس میں آپ کی پیدائش۔ ابتدائی زندگی۔ دعوت۔ آپ کے خلاف سازش۔ ہجرت۔ وغیرہ کے واقعات کے علاوہ، عیسائیت کے غلط عقائد۔ الوہیت۔ ابنیت کفارہ وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

آخر میں تمام انبیائے سابقہ اور امم گذشتہ کے احوال و ظروف پر نگہ بازگشت ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب معارف القرآن جلد سوم کے متعلقہ حصہ کا جدید ایڈیشن ہے جسے مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت قریب پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد -/-/6 روپے

(سابقہ اشاعت میں غلطی سے -/5/8 لکھی گئی تھی)

نوٹ:۔ پیشگی خریداران میں سے جو حضرات کتاب نہ منگانا چاہیں وہ ۱۵ اگست تک مطلع فرمادیں۔ بصورت دیگر کتاب ارسال خدمت کر دی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام 25/B گل برگ کالونی۔ لاہور

انتہائی کم قیمت پر بہترین کپڑا

96000

☆ ــــــ اعلیٰ درجہ کی سفید شرٹنگ

☆ ــــــ مرغا چھاپ سفید شرٹنگ

☆ ــــــ دل چھاپ ساٹن ڈرل وغیرہ وغیرہ

میسرز علی محمد اسمٰعیل 39A/S مولجی جیٹھا مارکیٹ کراچی

نیز

مل اونرز ریٹیل کلاتھ مارکیٹ، پرانی نمائش
بندر روڈ ایکسٹینشن کراچی سے بھی مل سکتا ہے۔

داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ کراچی